لالۂ طور

اختر شیرانی کے کلام کا تیسرا مجموعہ

کتاب منزل لاہور

مندرجات

چہرہ نما

اگرچہ لالۂ طور است روئے روشنِ او
چراغِ صبح بود یا بیاضِ گردنِ او

شیخ نیاز احمد پبلشر
نے اپنے علمی پرنٹنگ پریس لاہور میں باہتمام میاں فیروز الدین پرنٹر چھپوا کر کشمیری بازار لاہور سے شائع کی۔

نذر

"ق"

اے ہدہدِ صبا بہ سبا می فرستمت | بنگر کہ از کجا بہ کجا می فرستمت

زنہار عرضہ دہ برِ جاناں پیام ما | "زینجا بہ آشیانِ وفا می فرستمت"

"در راہِ عشق مرحلۂ قرب و بُعد نیست | می بینمت عیان و دعا می فرستمت

ہر صبح و شام قافلۂ از دعائے خیر | در صحبتِ شمال و صبا می فرستمت

در روئے خود تفرجِ صنعِ خدائے کُن | کائینۂ خدائے نما می فرستمت

تا لشکرِ غمت نکند ملکِ دل خراب | جانِ عزیزِ خود بفدا می فرستمت

ہر دم غمے فرست مرا و بگو بساز | کایں تحفہ از برائے خدا می فرستمت

اے غائب از نظر کہ شدی ہم نشینِ دل! | می گویمت دعا و ثنا می فرستمت

تا مطربان ز شوقِ منت آگہی دہند

نظم و غزل بہ ساز و نوا می فرستمت"

اردو کی رومانی شاعری اور اختر شیرانی

ایک مقالہ جو پٹنہ کالج میں پڑھا گیا

از

پروفیسر سید اختر احمد اختر اورینوی - ایم - اے

اردو شاعری کا موجودہ دور عہدِ رومان کہا جا سکتا ہے۔ دورِ جدید کی شاعری اپنے تمام اختلافات کے ساتھ ایک مشترک روح رکھتی ہے۔ جو رومانیت کے سرچشمے سے سیراب ہو رہی ہے۔

شاعری کیا ہے؟ یہ بھی زندگی کی مختلف کیفیتوں کی طرح ایک کیفیت ہے۔ اور رومانیت ایک خاص انداز کی کیفیتِ زندگی ہے۔ نفس کی ایک مخصوص حالت کو رومانیت سے تعبیر کرتے ہیں جس میں جذباتی کیفیات عقلی کیفیات سے زیادہ نمایاں ہوتی ہیں اور تخیل کے سمندِ ناز کو ایک اور تازیانہ لگ جاتا ہے۔

تخیل و جذبات کا ابھر جانا رومانیت کی روحِ رواں ہے۔ رومانیت کی ایک اور اہم خصوصیت انفرادیت ہے۔ مگر انفرادیت رومانیت کا سبب نہیں نتیجہ ہے۔ رومانی تخیل کائنات کو ایک نئے طور پر دیکھتی ہے اور رومانی جذبات عالم کو ایک جدید رنگ میں ڈوبا ہوا پاتے ہیں۔ اور اس کا لازمی نتیجہ انفرادیت ہے۔

رومانی شاعری زندگی کی تعمیرِ نو ہے۔ یہ روح کا ارمان بہشت آفرینی ہے۔ انسانی دل کی ازلی تشنگی کی بے قراریاں اس کی رگِ جان میں پھڑکتی نظر آتی ہیں۔ رومانیت رعنائی حیات کا خواب بیداری ہے جب نفس پر رومانی رنگ چڑھتا ہے۔ تو دل ایک بالیدگی محسوس کرتا ہے اور روح کا افق وسیع تر ہوتے ہوتے لامحدود ہو جاتا ہے اور اس افقِ بیکراں کی آغوش میں آفتاب ہائے تازہ انوار فشاں ہوتے ہیں۔ رومانی شاعر جب مناظرِ فطرت اور مظاہرِ حیات سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ تو وہ لطف اندوزی باطنی ہوتی ہے۔ اس وقت حسن و صداقت ہم آغوش نظر آتے ہیں۔

موجودہ رومانی شاعری نفسیاتی اثر کے تحت ظہور پذیر ہوئی ہے۔ یہ تجدید ہے اردو شاعری کی رومانیت اولیں کی جس طرح انگریزی شاعری میں ایک شیکسپیئر کا رومانی دور تھا اور دوسرا ورڈز ورتھ اور شیلے کا اسی طرح اردو شاعری کا پہلا رومانی دور میر مرزا کا عہد تھا اور دوسرا رومانی دور عہد حاضر ہے۔ رومانیت کے عروج ہی کے زمانے میں یعنی غالب و مومن کے دور میں "کلاسیت" نے جڑ پکڑ لی تھی۔ حالات کا اختلاف یا بزبان دیگر ماحول کا اختلاف دونوں رومانی دوروں میں مابہ الامتیاز ہے۔ جو ذہنی۔ اقتصادی سیاسی حالات آج موجود ہیں وہ اس وقت نہ تھے۔ لیکن نفسیاتی نقطۂ نظر سے دونوں یکساں ہیں۔ کیونکہ دونوں پر جذبات و تخیل کی حکومت ہے۔

قبل اس کے کہ میں موجودہ رومانی شاعری کی تخلیق و تاسیس اور ارتقاء و عروج پر نظر ڈالوں نفسی حیثیت سے ادب میں انقلابات کے وجوہ پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔ ادب حیات کا نبض پیما ہے۔ زندگی کو اگر آپ ایجاز بلیغ کی صورت میں دیکھنا چاہتے ہوں۔ تو ادب کو دیکھیے۔ عروس حیات آئینۂ ادب میں اپنی صورت دیکھتی ہے۔ پہلے نفس میں انقلاب ہوتا ہے پھر اس کا اثر زندگی کی مختلف کیفیتوں میں عریاں نظر آتا ہے۔ اگر انقلاب نفسی کے اظہار کی اور راہیں مسدود ہیں تو انقلاب کا اثر ادب میں بہت گہرا نظر آئیگا۔ اب آیئے حقیقت انقلاب کا تجزیہ کیا جائے۔

انسان کی روح بھی اس کے جسم کی طرح "اجزائے مختلف" سے بنتی ہے۔ گو "کل" کی طرح یہ مختلف "جز" بھی لطیف، غیر مرئی اور غیر مادی ہوتے ہیں۔ جب جسم میں کسی عنصر کی کمی ہو جاتی ہے۔ تو اس کی شدید خواہش پیدا ہوتی ہے۔ آپ اگر میٹھا کھاتے رہئے تو ایک وقت ایسا آئیگا۔ کہ نمک کی طرف آپ کو ناقابل برداشت رغبت ہوگی۔

حیوانی دنیا میں بھی امر مذکور کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ ہرنوں کا گروہ ناگاہ، امریکہ کے جنگلوں کے شاداب سبزہ زاروں کو چھوڑ کر سوکھی ہوئی جھیلوں کی طرف دیوانہ وار دوڑ جاتا ہے۔ تاکہ وہاں جا کر نمک چاٹ سکے۔ جب نمک کی ضرورت پوری ہو جاتی ہے تو سارا "گلہ" چراگاہوں کو واپس آ جاتا ہے۔ سیاسی و معاشی۔ مذہبی و معاشرتی انقلابوں کی بنیاد بھی نفس ہی میں پڑتی ہے۔

انسانی روح کے اجزائے تعمیری کی کمی و بیشی نفسی انقلاب کا سبب اولیں ہوتی ہے۔ اگر انسانی نفس کو صرف عقلی فضائیں ملتی رہیں۔ تو ایک وقت وہ جذبات سے سیراب ہو جاتا ہے تو نفس عقل کی بھوک محسوس کرتا ہے۔

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

موجودہ رومانی رجحان مظہر ہے اس نفسی انقلاب کا جو معاشرہ کی روح میں آیا اور یوں تو یہ ظاہراً ردّ عمل ہے لکھنؤ اسکول کی "کلاسیکی" (Classicism) شاعری کے خلاف مگر باطناً خود کلاسی شاعری مظہر تھی اس دور کی نفسی حالت کی معاشرہ کا "نفسِ اجتماعی" (Collective Unconscious) ادب کے ذریعے ظہور کرتا ہے۔

اب آئیے، سرِ سری، ذرا "کلاسیت" (Classicism) اور اردو کی کلاسی شاعری کا جائزہ لے لیا جائے۔

لکھنؤ کی کلاسیکل شاعری } دہلی کی بربادی کے بعد لکھنؤ کا عروج ہوا اور آرزوئے جدت میں لکھنؤ اسکول کی بنا پڑی۔ یوں تو نصیر دہلوی نے بھی خالص کلاسی شاعری کے نمونے پیش کئے۔ مگر اس صنف کو ناسخ اور ان کے پیروؤں نے تکمیل کے ساتھ برتا۔ لکھنؤ نے دہلی سے الگ ہو کر ایک جدید تہذیب کی ابتدا کی۔ مگر اس جدت میں زندگی نہیں تھی۔ ہندوستان کے ارسوفواز طبقہ پر اضمحلال طاری ہو چکا تھا۔ ہر سو پسپائی تھی۔ ہر جانب موت۔ لکھنؤ کی نئی تہذیب حیات سے ہم کنار نہ تھی۔ بلکہ وہ ایک سوانگ تھی زندگی کا۔

صرف ادب و شعر ہی میں نہیں بلکہ تہذیب کے ہر شعبہ میں لکھنؤ پر ایران کی کلاسیت کا اثر پڑا جس طرح پوپ اور ڈرائیڈن کے زمانے میں لاطینی کلاسیت کا انگریزی ادب و تمدن پر اثر پڑا تھا۔

کلاسیت کی خصوصیات یہ ہیں کہ نفسِ شعر سے زیادہ قواعد و ضوابط کی پابندی۔ الفاظ کی تراش و خراش آرائش و زیبائش اور صنائع و بدائع پر زور دیا جاتا ہے۔ ایسی شاعری کی مثال حنوط شدہ لاشوں کی سی ہے۔ خارجی شوخی و طرحداری پر تو کافی وقت صرف کیا جاتا ہے۔ مگر روح کا فقدان ہوتا ہے۔

کلاسی شاعری میں انفرادیت کا فقدان تھا۔ کیونکہ انفرادیت نتیجہ ہے زندگی کا اور کلاسی شاعری ایک دم توڑتی ہوئی تہذیب کی زبان تھی۔ دلبستان لکھنؤ نام ہے بے چارگی کی تقلید کا۔ بیمار جذبات کا۔ مدفون تخیل کا!

کلاسیت کی خوبی یہ ہے کہ اس دلبستان میں بے لاہروی خود سری و جنون پسندی نہیں، جذبات کی باگ کامل طور پر عقل کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ کلاسیت ناکاروں کے ہاتھوں میں فرسودگی اور موت میں تبدیل ہو جاتی ہے مگر کارزاں

شخصیتوں کے قبضے میں آکر تناسب فن کی بہترین مظہر ہوتی ہے۔ اردو کی خوش بختی سے لکھنؤ میں ایک نابغہ "Genius" پیدا ہوا جس نے کلاسیت اور رومانیت کو ہم دست کر دیا۔ نابغہ قواعد کا پابند نہیں ہوتا۔ بلکہ قواعد کو پابند کر لیتا ہے۔ وہ کسی دبستان (School) کا پیرو نہیں بلکہ دبستان اس کی پیروی کرتے ہیں۔ وہ ماحول سے متاثر تو ضرور ہوتا ہے مگر ماحول پر بھی اپنی خاتمیت کی مہر لگا جاتا ہے۔ نابغہ اپنے زمانہ کا فرزند تو ہوتا ہے مگر آنے والے زمانے کا باپ بھی۔

انیس کلاسیت کے تقلیدی دور میں رہ کر بھی کلاسیت سے بلند تھا۔ اس کی شاعری میں ہمیں کلاسیت اور رومانیت کی خوبیاں نظر آتی ہیں اور ان کی برائیاں وہاں ناپید ہیں۔ انیس کا آرٹ یونان کے مشاہیر ادب و شعر کے فن سے مشابہ ہے۔ اس استثناء کے علاوہ دور کلاسیت کی شاعری ایک فرسودہ مضمحل بیمار۔ بے جان اور غیر فطری شاعری تھی۔ جس طرح ناامیدی کے قلب میں امید کی چنگاری روشن ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح کلاسیت کی تاریکیوں میں افق بہار پر ایک تابندہ ستارۂ صبح طلوع ہوا۔ ہر چند کہ شاد کلاسی سکول کی پیداوار تھے۔ مگر ان کی شاعری میر اور مومن کی یاد دلاتی ہے۔ یہ بھی رومانیت کی صبح صادق۔ اس کے بعد رومانیت کے شفق زاروں میں نظیر اکبر آبادی اور حالی نے لالہ کاریاں کیں۔

اردو شاعری سے نظیر کا وہی تعلق ہے جو برنس (Burns) کا انگریزی شاعری سے ہے۔ دونوں نے رومان کی بانسریاں بجائیں مقامی نے کے ساتھ۔ مگر ان کے نغمے بلا کے دلفریب تھے کسی پرستان سے آنے والے گیتوں کی طرح اور حالی کی مثال ورڈز ورتھ (Wordsworth) اور کولرج (Coleridge) سے دی جاسکتی ہے حالی کا مقدمہ شعر و شاعری "لیریکل بیلاڈز" (Lyrical ballads) کے دیباچہ (Preface) کی طرح ہے دونوں دیباچوں نے اپنی اپنی شاعری میں انقلاب برپا کر دیا غرض نظیر حالی اور شاد۔ رومانی شاعری کے علم بردارانِ اولین ہیں۔

اردو میں رومانی شاعری کا دوسرا دور — اب میں رومانی شاعری کے پس منظر (Back Ground) اور ماحول (Environment) اور ان مہیجات و تحریکات کی طرف رجوع کرتا ہوں جنھوں نے اس پھلنا پھولتا ڈالا۔

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ہمارے ہندوستانی معاشرے پر ایک متلاطم اثر تھا۔ ایک اعلیٰ تمدن کی سر بفلک عمارت کے کھنڈروں کی اینٹیں بٹ رہی تھیں۔ ہر طرف تخریب۔ ہر سو تباہی تھی۔ فطرت ایک ایسی نسل کو مٹا رہی تھی جس نے اپنے مٹنے کا سامان خود کیا تھا۔ اپنے ہاتھوں لوگوں نے اپنی قبریں کھود لی تھیں۔ اور اب غیر ان کی لاشیں دفن کر رہے تھے۔ ان بدبختوں کو تو اپنی تباہی کا احساس بھی نہیں رہا تھا۔ لیکن نوزائیدہ نسل جو اگرچہ آدم کے گناہ کی وارث تھی) اپنے دل میں ایک بے اطمینانی محسوس کر رہی تھی۔ کیونکہ فردوس گم شدہ میں اس سے تو خطائیں سرزد نہیں ہوئی تھیں وہ کیوں سزائیں بھگتنے۔ بیٹا اپنے باپ سے مختلف بھی ہوتا ہے اور مشابہ بھی۔ جدید نسل کی روح نیم معصوم ضرور تھی۔ لہٰذا یہ اپنی موجودہ حالت پر مطمئن نہ تھی۔ اسے جنت کی بازیافت کی آرزو ستانے لگی تھی۔ لوگ چاہتے تھے کہ حالات بدلیں۔ یہی حالت تھی کہ مغربی تہذیب کے اقدام نے معاشرہ کو اور چونکا دیا۔ مغربی تعلیم و تہذیب اور معاشرت کا اثر ہوا۔ حکومت کے چراغ کاشانۂ اغیار میں جلتے نظر آئے۔ عیسائی مشنریوں کی تگ و دو نے آرام سے سوئے ہوئے عقائد تک کو جھنجھوڑ کر تحت الشعور کے گوشۂ عافیت سے جگایا۔ یہ بے اطمینانی کا دور تھا۔ جو اپنا دامن ہمارے زمانے تک وسیع کئے ہوئے ہے اور یہی رومانیت کا بیج ہے۔ رومانیت نام ہے روزمرہ کی بے کیفی سے اجتناب کا۔

عین اس وقت دو تحریکیں آ گے آئیں۔ ایک تو علی گڑھ کی تحریک اور دوسری پنجاب کی۔
علی گڑھ کی تحریک یہ تھی کہ فرسودگی کے خیال کو معاشرے سے رفع کرنا چاہیئے۔ اور جدید بنیادوں پر تہذیب کی عمارت اٹھانی چاہیئے۔ اس تحریک سعید کا یہ نتیجہ ہوا کہ سماج میں ایک روشن خیال طبقہ پیدا ہو گیا۔ جو نئی تعلیم سے آراستہ تھا۔

دوسری تحریک کا مرکز پنجاب تھا۔ اس تحریک کی یہ کوشش تھی کہ لوگ پھر تہذیب حجاز کی طرف رخ کریں۔ پھر وہی اگلے ولولے پیدا ہوں۔ پھر وہی سادگی ہو۔ اور روح کی بیداری۔ اس تحریک کی بنیاد جذبات پر تھی۔ اور یہ عقل کے میدان میں بھی جذبات کے گل بوٹے اگانا چاہتی تھی۔

لازماً دوسری تحریک کا اثر پنجاب کی رومانی شاعری پر پڑا۔ موجودہ بے کیفی سے انحراف اور ایک نئی دنیا کی تعمیر یہ تھی بنیاد رومانی شاعری کی۔ زندہ دلانِ پنجاب نے اس بے کیفی کا علاج ماضی میں تلاش کیا۔ اور نئی تہذیب کا

نمونۂ تہذیب حجاز کے پرشکوہ آثار میں ڈھونڈا۔ اس گروہ کے سالارِ کارواں اقبالؔ ہیں۔

پہلی تحریک کا اثر صوبہ متحدہ میں ہوا۔ اس گروہ کے علمبردار جوشؔ ملیح آبادی ہیں۔ ان کی رومانیت ایک نئی دنیا کی تعمیر چاہتی ہے۔ یہ انقلاب کے رجز خواں ہیں۔ اس جماعت پر یورپ کی جدت نے اپنا اثر ڈالا۔ یہ مغرب پر مغرب کے جدید ترین ہتھیاروں سے ہی فتح پانی چاہتے ہیں۔ اور اوّل الذکر گروہ عربی نیزوں پر بھروسہ رکھتا ہے ایک مستقبل کو ماضی کے آئینہ میں دیکھتا ہے اور دوسرا مستقبل کو مستقبل کی حیثیت سے دیکھنا چاہتا ہے۔

جس طرح بائرنؔ اور کیٹسؔ تہذیب یونان کے شیدائی تھے بالکل اسی طرح اقبالؔ تہذیب حجاز کے گرویدہ ہیں اور جوشؔ انقلاب کا قرنا پھونکتے ہیں۔

انقلاب فرانس نے انگریزی رومانی شاعری کو متاثر کیا تھا اور انقلاب روس نے اردو کی رومانی شاعری پر اثر ڈالا۔ ہندوستان میں جنگِ عظیم سے پہلے ہی تحریک آزادی شروع ہو چکی تھی۔ حریت کی رگوں میں خون دوڑنے لگا تھا کہ جنگِ عظیم کی قیامت برپا ہوئی اور اس کے اختتام پر روس کی زاریت تباہ ہو گئی اور کتنے شہنشاہوں کی کج کلاہیاں خاک میں مل گئیں۔ جنگ کے بعد ہندوستان میں ترکِ موالات کی تحریک کا عروج ہوا۔ اور پھر پے بہ پے قانون شکنی اور عدم ادائیگی محصولات کی مہمیں شروع ہوئیں۔ دوسرے ممالک میں بھی انقلاب پر انقلاب ہو رہے تھے۔ ترکوں نے فرسودہ جامۂ خلافت کو اتار کر پھینک دیا اور جمہوریت کی بنا ڈالی۔ ایران نے بھی جمہوری نظام کو پسند کیا۔

شہنشاہیت اور جمہوریت کے درمیان والی کڑی "مطلقیت" (Dictatorship) ہے۔ لہٰذا روس جرمنی۔ ترکی۔ ایران وغیرہ میں یہی نظامِ سلطنت پسند کیا گیا کہ بہ تربیت ملک و ملت کے لئے نہایت ضروری ہے۔

ان تبدیلیوں کے علاوہ معاشرے میں ذہنی انقلاب بھی ہو رہا ہے۔ پرانے نظریئے بدل رہے تھے۔ ماضی کے قوانین پر نکتہ چینیاں زور وں سے شروع ہو گئی تھیں۔ فلسفۂ اخلاق پر نظر ثانی کی ضرورت پیش آ گئی تھی۔ اور "نسائیات" کے متعلق لوگ زیادہ فطری طور پر غور کرنے لگے تھے۔ داعیات شباب اور جنسیات ہر چند کہ پرانے طرز کے لوگوں میں قطعی مردود تھے۔ مگر ایک طبقہ ایسا ضرور پیدا ہو گیا تھا۔ جو فطرت کی پکار پر کان بند کر لینا پسند نہیں کرتا تھا۔ "غنچوں" اور "سبزہ آغاز" برہمن زادوں کی جگہ اب "سلمیٰ" اور "عذرا" لینے لگی تھیں۔

اسی ماحول میں ہماری موجودہ رومانی شاعری پرورش پاتی رہی ہے۔ اور اب تک پرورش پا رہی ہے ابھی ہمارے ماضی قریب اور حال میں چنداں تفاوت پیدا نہیں ہوا۔

"مجازیت" اور "انقلابیت" کے دو بڑے دھاروں کے علاوہ "رومانیت" کی اور سوتیں بھی ہیں جن میں "وطنیت" اور حسن پسندی کو امتیاز حاصل ہے۔ "وطنیت" نے چکبست کو ترجمان بنایا اور "زلیخائے رومان" نے اختر شیرانی کو اپنا "یوسف" بنانے کے لئے چُن لیا۔

اگر چکبست بھیم و ارجن، کرشن و رام کے قصیدہ خواں ہیں تو اختر سلمیٰ کے حسنِ صبیح کی یاد میں نغمہ سنج ہیں۔

اقبال، جوش اور چکبست تینوں دورِ زریں (Millenium) کے خواب دیکھتے ہیں۔ اقبال کے خواب کی تعبیر حجاز میں ہے۔ جوش کی انقلاب میں اور چکبست کی ہند قدیم میں۔ یہ تینوں فرسودہ دنیا کو بدل کر ایک نیا عالمِ رنگ و بو تخلیق کرنا اور حالات کا مقابلہ کرکے اسے تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی شاعری پیغامِ عمل ہے۔ ان تینوں کی رومانیت میں عملیت ہے۔

اختر کی شاعری کا پس منظر } ان کے برخلاف اختر شیرانی کی رومانیت میں گریز و ہجرت کی تمنا کروٹ لے رہی ہے۔ اختر نے امن و سکون کی تلاش عالمِ حسن میں کی وہ اس دنیا سے دور ایک نئی دنیا بسانی چاہتا ہے۔ اس کی شاعری میں رگِ جہد و عمل نہیں۔ وہ دنیا کو تبدیل کرنے کی آرزو تو رکھتا ہے مگر اس میں تابِ مقابلہ نہیں۔ اختر کا کلیجہ بھی ماحول کی بے کیفی اور پستی سے ریش ریش ہے۔ وہ حسن کے تبسم سے اپنے زخموں پر مرہم رکھنا چاہتا ہے مگر قاتل تبسم اور نمک افشاں ثابت ہوتا ہے۔ اختر اس دنیا سے ہجرت کرکے ایک دوسری دنیا میں، پھولوں سے بسی ہوئی دنیا میں، حسن و رعنائی کی دنیا میں، شراب و شباب کی دنیا میں چلا جانا چاہتا ہے، تاکہ اس کی روح کو چین نصیب ہو غرض حسن کا ایک وسیع تر مفہوم اختر کے لئے پیغامِ سکون ہے ملاحظہ ہو ؎

اے عشق کہیں لے چل اس پاپ کی بستی سے
نفرت گہِ عالم سے لعنت گہِ ہستی سے
ان نفس پرستوں سے اس نفس پرستی سے
دور اور کہیں لے چل!
اے عشق کہیں لے چل!

آنکھوں تلے پھرتی ہے اک خواب نما دنیا
تاروں کی طرح روشن، مہتاب نما دنیا
جنت کی طرح رنگیں، شاداب نما دنیا

للہ وہیں لے چل!
اے عشق کہیں لے چل!

اختر کی شاعری کی فضا } آئیے اب ہم اختر کی اُس آبادی کی سیر کریں یعنی اُس آبادی کی جس کو اُس کی رومانیت نے دنیائے مثال میں بسایا ہے اس جہانِ تازہ کے آسمان کے تارے زیادہ روشن اور دلفریب ہیں اس کی زمین زیادہ خوش رنگ اور زیادہ خوشبودار پھولوں سے معطر ہے اس کی خنک ہوائیں مے خانہ بدوش ہیں۔ وہاں کی فضا میں کیف و مستی کی ارزانی ہے۔ وہ ایک دنیائے حسن ہے۔ اختر کے سانیٹس (sonnets) پڑھئے آپ فوراً اُن کے ساحرانہ اثر سے اس خواب نما دنیا میں پہنچ جائیے گا اور دیکھئے گا کہ ع

"نظر کے سامنے رقصاں ہیں رنگیں وادیاں گویا"

آپ کو "افق پر موجزن آوارہ خوابوں کی گھٹائیں" دکھائی دیں گی۔ آپ "ستاروں کے سمندر، ماہتابوں کے جزیرے" دیکھئے گا اور وہاں

"سلمیٰ ابھی ہے پہلو میں سلمیٰ کی محبت بھی"

اختر کی تقریباً ہر نظم میں آپ کو اس کی مثالی دنیا کے جلوے نظر آئینگے کہیں وہ جلوہ بے محابا ہوگا۔ اور کبھی اس کی ایک جھلک آرزو انگیز ہوگی۔

اختر کی شاعری کی خصوصیات } اختر شیرانی کی زندگی اور شاعری کے بہت سے پہلو کیٹس (Keats) کی زندگی اور شاعری سے ملتے جلتے ہیں۔ اختر نے بھی کیٹس کی طرح عالم مثال کے حسن کو عالم مجاز میں دیکھا۔ کیٹس کی فینی اور اختر کی سلمیٰ ان کی شاعری کی روح ہیں۔ دونوں شاعر عشق ناکام کے نوحہ خواں ہیں۔

کیٹس کی طرح اختر کی شاعری شدید قسم کی جذباتی شاعری ہے۔ اختر کی نظم "اے عشق کہیں لے چل" اور "بد آج کی رات" جذبات شدید کی مظہر ہیں۔" اور "یس سے آنے والے بتا" بھی دردسے چور جذبات کی ترجمان ہے ملاحظہ ہو "آج کی رات"۔

کا آخری بند ؎

ہم میں کچھ جرأتِ گویائی بھی ہو گی کہ نہیں
ہمتِ ناصیہ فرسائی بھی ہو گی کہ نہیں
شرم سے دور شکیبائی بھی ہو گی کہ نہیں
"یوسفِ دل" سے "زلیخائی" بھی ہو گی کہ نہیں
آج کی رات! اُف او میرے خدا آج کی رات!

"آج کی رات! اُف او میرے خدا آج کی رات" میں جذبات کا سیلاب بند ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جذبات کی شدت سے تھک کر شاعر آخری بار پُر زور اظہارِ جذبات کر کے دل تھام کر بیٹھ جاتا ہے۔ یہ ایک اعلےٰ جذباتی نظم کا نہایت ہی فطری اختتام ہے۔

اختر کی شاعری میں حواسیہ (Sensuous) انداز بہت نمایاں ہے اور اس خصوصیت میں بھی وہ کیٹس کا شریک ہے۔ یوں تو خارجی مظاہر و آثار، حواس کے ذریعے سے ہر دل کو متاثر کرتے ہیں مگر بعض شعرا میں یہ تاثرات روح کی لطافت سے وافر حصہ پا کر جذبات کے ذریعے ظاہر ہوتے ہیں اور بعض میں حواسیہ اطلاعات اس درجہ شدید ہوتی ہیں کہ روح کی لطافتوں کا امتزاج ان سے نہیں ہو سکتا۔ اور جذباتِ خارجی محسوسات کو بغیر داخلی رنگ دیئے ہوئے نمایاں کر دیتے ہیں۔ کیٹس اور اختر دونوں کے یہاں حواسیہ حسن پسندی ہے۔ مگر کیٹس اس منزل سے گذر کر روح کی وسعتوں میں بھی گرمِ سفر ہوتا ہے۔ وہ حواسیہ حسن پسندی کے بعد "حسنِ قدرت" (Beauty of power) اور "حسنِ صداقت" (Beauty of truth) کو بھی دیکھ لیتا ہے۔ مگر اختر کی شاعری کو شاید ابھی یہ منازل پسند نہیں۔ گو کبھی کبھی اس کی نظر اس مقام تک پہنچ جاتی ہے۔ اس بارے میں اختر پر عربی شاعری کا اثر ہے۔ امراؤ القیس کی طرح اختر بھی فطری جذبات کا اظہار نہایت سادگی سے کر دیتا ہے۔

اختر شیرانی کا عام رنگ ملاحظہ ہو۔

مری آغوش میں ہو گا وہ جسمِ مرمریں اُس کا
وہ اُس کے سرمئی کاکل وہ روئے نازنیں اُس کا

وہ رخسارِ حسیں اس کے وہ جسمِ یاسمیں اُس کا
وہ جس سے شوق کی دنیا کو مہکائے گی وادی میں
سُنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں

تمنا و جبا کی کشمکش کیوں کر مٹاؤں گا
میں اُس کے یاسمیں پیکر کو کیسے گدگداؤں گا
اور اس کے لعل لب سے کس طرح بوسے چراؤں گا
وہ پھولوں اور ستاروں سے بھی شرمائے گی وادی میں
سُنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں

اختر کی حواسیہ شاعری ایک مقام پر ابیقوریت (Epicureanism) یعنی انتہائی لذت پسندی کے غار میں جا گرتی ہے۔ اگر اختر ان مقامات سے گزر جاتے۔ یا گزر جانے کی سعی کرتے رہتے تو ان کی لغزشیں زیادہ پیاری معلوم ہوتیں مگر ان کی شاعری میں ناقابلِ عفو جمود نظر آتا ہے ملاحظہ ہو ان کی لذت پسندی سے

یہ نغمے، یہ ترانے، یہ شراب و شعر کا عالم
یہ آرائش مکانوں کی، یہ زیبائش مکینوں کی
یہ رعنائی حسینوں کی۔ یہ صحبت نازنینوں کی
یہ عمریں، یہ بہاریں یہ شباب و شعر کا عالم
نہ لے جا خلد میں یارب یہیں رہنے دے تو مجھ کو
یہ دنیا ہے تو جنت کی نہیں ہے آرزو مجھ کو

اور ان دنوں تو ان کی شاعری میں شدید انحطاط کے آثار نظر آتے ہیں۔ سنئے! سے

ذکرِ شبِ وصال ہو گیا قصہ مختصر
جس بات سے وہ ڈرتے تھے وہ بات ہو گئی

اختر کا مخصوص آرٹ } اختر کا آرٹ بھی اس کی خصوصیاتِ شاعری میں داخل ہے۔ اختر ایک باکمال فن کار ہے، وہ جن لذتوں سے خود بہرہ یاب ہوتا ہے۔ ان سے دوسروں کو بھی پورے طور پر اپنی صنعت کے اثر سے بہرہ یاب کر سکتا ہے۔ اختر کیٹس کی طرح الفاظ سے بت گری بھی کرتا ہے اس مجسم تصویر کشی (Concrete imagery) میں اختر کا بہت بڑا درجہ ہے۔ اس کے صنم کدۂ شعر میں بہت ہی حسین و جمیل نقوش ہوتے ہیں۔ اس کے بنائے ہوئے اصنام زندگی سے بہرہ یاب نظر آتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ؎

وہ پہلی چاندنی نے رات کو کھلی چھت پر — ادا سے سوتے ہوئے بار بار دیکھا ہے
سنہری دھوپ کی کرنوں نے بام پر تم کو — بکھیرے گیسوئے مشکیں بہار دیکھا ہے
سنہرے پانی میں چاندی سے پاؤں لٹکائے — شفق نے تم کو سرِ جوئبار دیکھا ہے

چونکہ اختر کی بت گرانہ مصوری میں زندگی ہے۔ لہٰذا ہمیں ان بتوں میں حرکت اور آواز کا سراغ بھی ملے گا جنہیں اس نے تخلیق کیا ہے ؎

اودیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی وہاں کے پن گھٹ پر پنہاریاں پانی بھرتی ہیں
انگڑائی کا نقشہ بن بن کر سب ماتھے پہ گاگر دھرتی ہیں
اور اپنے گھروں کو جاتے ہوئے ہنستی ہوئی چہلیں کرتی ہیں
اودیس سے آنے والے بتا!

اختر کی "حقیقت کی موہوم راتوں" کی طرح اس کے فن میں بھی "محقق" اور "موہوم" چیزیں پائی جاتی ہیں۔ اختر غیر مرئی اشیاء کی بھی تصویر کشی کرتا ہے ملاحظہ ہو ؎

او دیس سے آنے والے بتا!
کیا شام پڑے سڑکوں پہ وہی دلچسپ اندھیرا ہوتا ہے
اور گلیوں کی دھندلی شمعوں پر سایوں کا بسیرا ہوتا ہے
باغوں کے اندھیرے گوشوں میں جس طرح سویرا ہوتا ہے — او دیس سے آنے والے بتا!

یہ مرئی اور غیر مرئی نقوش علیحدہ علیحدہ پائے جانے کے علاوہ کہیں ہم دست بھی نظر آتے ہیں یعنی اختر دھندلے دھندلے نقوش اور ابھری ہوئی قلم کاریوں کا امتزاج صناعانہ کمال کے ساتھ کرتا ہے۔ اس مقام پر اختر کا فن سحر بن جاتا ہے۔ یہ "شہریت" اور "مادیت" کا امتزاج ہے شیلے اور کیٹس کے فن کا اتحاد ملاحظہ ہو ؎

سردیوں کی چاندنی شبنم سے کہلاتی تھی جب
باغ پر اک دھندلی دھندلی سی چھا جاتی تھی جب
آہ وہ راتیں! وہ راتیں یاد آتی ہیں مجھے!

جب تم آجاتی تھیں بازلفِ پریشاں تا کمر!
مشک آگیں تا بداماں عنبر افشاں تا کمر!
آہ وہ راتیں، وہ راتیں یاد آتی ہیں مجھے!

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خواب و خیال کی دنیا سے آرزو اور ارمان کی بستی سے راز کے دھندلے رومانی نقاب کو اٹھا کر ایک "پیکرِ ناز" اندر اسن کی پری کی طرح اس عالم رنگ و بو میں اچانک آجاتی ہے۔ پہلے دو مصرعوں پر "ابہام" کا پردہ رنگین ہے اور آخری دو مصرعوں میں "حقیقت" ڈرامائی انداز میں جلوہ گر ہوتی ہے۔

اختر ایک ماہر محبت گر ہی نہیں بلکہ وہ باکمال مصور بھی ہے۔ اس کے "بتکدے" کی طرح اس کے "ارژنگ" میں بھی کبھی زندگی مسکراتی نظر آتی ہے اور کبھی گریاں۔
آئیے ارژنگِ اختر کی سیر کیجئے!

کھجوروں کے تلے وہ جو کھنڈر سے جھلملاتے ہیں
بہ نسبت ریحانہ کے معصوم افسانے سناتے ہیں
صبا شاخوں میں نخلستاں کی جس دم سرسراتی ہے
مجھے ہر لہر سے ریحانہ کی آواز آتی ہے
کھجوروں کے حسین سائے زمیں پر لہلہاتے تھے
ستارے جگمگاتے تھے شگوفے کھلکھلاتے تھے

یاس

کیا شام کو اب بھی جاتے ہیں احباب کنارِ دریا پر؟
وہ پیڑ گھنیرے اب بھی ہیں شاداب کنارِ دریا پر؟
اور پیار سے آکر جھانکتا ہے مہتاب کنارِ دریا پر؟
او دیس سے آنے والے بتا!

کیا اب بھی گجر دم چرواہے ریوڑ کو چرانے آتے ہیں
اور شام کے دھندلے سایوں کے ہمراہ گھروں کو آتے ہیں
اور اپنی رسیلی بانسریوں میں عشق کے نغمے گاتے ہیں
او دیس سے آنے والے بتا!

اختر کی بنائی ہوئی تصویروں میں بھی حرکت اور آواز ہے۔ اختر ان تصویروں کی رنگینی میں اپنے دل کے خون کی چند چھینٹیں بھی دے دیتا ہے۔ ہمیں ان تصویروں کے لبوں پر پُر درد مسکراہٹ کھیلتی دکھائی دیتی ہے اور ان کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی نظر آتی ہے۔ اختر اپنی تصویروں کے سینے میں "دل" بھی رکھ دیتا ہے۔ اس کی مخلوق جذبات سے عاری نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کی جادوگری سے بے جان اشیاء میں بھی جان پڑ جاتی ہے۔ "شگوفوں کے کھلکھلانے" اور "چاند کے پیار سے آکر جھانکنے" کا منظر پیش کرنا ایک تخلیقی فن کاری (Creative Art) ہے۔ اختر جذبات و واردات کو بھی صورت بخشتا ہے۔ وہ روح کو جسم کا لباس عطا کرتا ہے۔ وہ غیر محسوس چیزوں کی تعبیر محسوسات میں کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو؎

وہ راتیں جب محبت کے فسانے جاگ اٹھتے تھے
ربابِ دل کے خوابیدہ ترانے جاگ اٹھتے تھے
سکوں سوتا تھا جب بنتا بیاں ہشیار ہوتی تھیں
وہ راتیں جن میں دل کی دھڑکنیں بیدار ہوتی تھیں

اختر بُت گر اور مصوّر ہونے کے ساتھ ساتھ مغنّی بھی ہے۔ اس کی شاعری میں غضب کی موسیقی ہے۔ شاعری کا غنائی پہلو "نغمیت" (musical element) کی جان ہے۔ نغمہ و موسیقی شاعری کے شہ پر ہیں۔ درد سے لبریز جذبات اس کی رُوح اور تخیّل وہ ازلی قوت ہے۔ جس کی مدد سے شاعری کی مملکت وسیع تر ہوتی جاتی ہے۔
اختر مختلف طریقوں سے موسیقی پیدا کرتا ہے۔ مترنّم بحر و قوافی کا، نرم، شیریں، لچکیلے الفاظ کا اور ہندی کے رسیلے شبدوں کا استعمال وہ نہایت ہی موزوں انداز سے کرتا ہے اور کبھی وہ جملوں کی تکرار سے موسیقیت پیدا کرتا ہے۔ سنئے:

گنوا نہ سوگ میں اپنے شباب کی راتیں
نہ ہاتھ آئیں گی پھر ماہتاب کی راتیں
یہ کھنوں کا ہجوم اور یہ خواب کی راتیں
فضا پہ خواب کی مانند چھا بھی جا سلمیٰ
بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ

کیا گاؤں پہ اب بھی ساون میں برکھا کی بہاریں چھاتی ہیں
معصوم گھروں سے بھور بھئے چکی کی صدائیں آتی ہیں
اور یاد میں اپنے میکے کی بچھڑی ہوئی سکھیاں گاتی ہیں
او دیس سے آنے والے بتا!

انتظار میں ع

"سُنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں"

کی تکرار دلچسپ ہے۔ "جہاں ریحانہ رہتی تھی" میں ع

"یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی" کی
"او دیس سے آنے والے بتا" میں اسی جملے کی تکرار ہے۔

اردو اور فارسی شاعری میں ردیف اور قافیہ سے موسیقیت کی تخلیق میں کافی مدد ملتی ہے۔ اختر تکرار ردیف اور حسنِ قوافی سے اپنی نظموں کو مترنم اور دلکش بناتا ہے اور کبھی گونجنے والے قافیہ کے لفظ کو وہ ایک ہی مصرعہ میں دہراتا ہے سنئے ؎

اودیس سے آنے والے بتا
اودیس سے آنے والے بتا کس حال میں ہیں یارانِ وطن؟
آوارۂ غربت کو بھی سنا! کس رنگ میں ہے کنعانِ وطن؟
وہ باغِ وطن، فردوسِ وطن، وہ سروِ وطن، ریحانِ وطن؟
اودیس سے آنے والے بتا

"آن" کا قافیہ اور "ن" پر ٹوٹنے والی ردیف اور پھر "وطن" کا خانائی تھرتھری پیدا کرنے والا لفظ کس حسن کے ساتھ استعمال کئے گئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ستار بج رہا ہے "بتا" اور "سنا" کا ہم قافیہ ہونا اور تھرتھری کی صدا کی طرح "اودیس سے آنے والے بتا" کی تکرار یہ سب مل کر روح و دل کو ایک مدہوش بیداری کا پیام سناتے ہیں۔
تخیّل اور درد} رومانیت نام ہے جذبات اور تخیّل کی بیداری کا۔ اختر ایک رومانی شاعر ہونے کی حیثیت سے سرمایہ دار تخیّل اور سرگشتۂ جذبات ہے۔ اس کا تخیّل اس کے فن کے مطابق اور اس کے ذوق کے متناسب ہے۔ اور اس کے جذبات حسن حسن پسندی کے بھیر کائے ہوئے ہیں۔
رومانیت تخیّل کا ایک نیا ہوش ہے۔ تخیّل رسا حقائق اشیا کو دیکھ لیتا ہے اور مختلف اشیا کے درمیان تعلقات کو پہچانتا ہے۔
مادی حقیقتیں صرف حقیقتیں نہیں ہوتیں۔ بلکہ حقیقت کی غیر مادی روح بھی ہوتی ہے اور وہ بھی حقیقت ہی کی ایک لطیف تعبیر ہے تخیّل اس راز سے آگاہ ہو جاتا ہے۔
تخیّل اس "کثرت" کے بکھرے ہوئے موتیوں کو "وحدت" کے ریشمی تار میں پروتا ہے۔ وہ مخلوق و خالق میں فرق مراتب قائم رکھتے ہوئے ان کے صحیح تعلق سے واقف ہو جاتا ہے۔ وہ شیطان تک کو فراموش نہیں کرتا

بلکہ اس کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے اسے اس کا مناسب مقام عطا کرتا ہے۔
ایک رعنائی شاعر کی زبان سے ابلیس۔ جبرئیل سے کہتا ہے ؂

گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو؟
میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو!

اختر شیرانی کا تخیّل اپنی مخصوص فضامیں کامیابی کے ساتھ پرواز کرتا ہے۔ مگر یہ فضا محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ اور اسی تحدید میں اختر کی قوت اور کمزوری بیک وقت پائی جاتی ہے اسی تحدید کے سبب سے اس کے مخصوص رنگ میں تیزی اور چمک پیدا ہو گئی ہے اور اسی حد بندی کی وجہ سے اس کی شاعری میں تنوع کی سخت کمی ہے۔
حسن کے حواسی شعور اور اس کی تعبیر و اظہار کی طرف اختر کا تخیّل مرکوز ہے۔
جدید تشبیہہ و استعارات۔ پھڑکتا ہوا خیال تخلیقِ حسن اور کسی خاص عالمِ نو کی تعمیر یہ سب مظاہر ہیں تخیّل کے۔ ملاحظہ ہو:-

بہار و خواب کی تنویرِ مرمریں عذرا
شراب و شعر کی تفسیرِ دل نشیں عذرا

شبستانِ جوانی کا تو اک زندہ ستارہ ہے
تو اس دنیا میں بحرِ حسنِ فطرت کا کنارہ ہے
تو اس ستارہ میں اک آسمانی خواب ہے سلمیٰ!

غائب از چشم تھی جنّت کی بہاروں کی طرح
دستِ انساں سے تھی محفوظ ستاروں کی طرح
صبح کی طرح سے دوشیزہ تھی ہستی تیری
بوئے گُل کی طرح پاکیزہ تھی ہستی تیری
تیرے اشعار بہشتوں کی بہاروں کے ہجوم
تیرے افکار تھے یا چاند ستاروں کے ہجوم

اخترؔ کے تخیّل کی خلّاقی دنیائے حسن کو بسانے میں صرف ہوتی ہے۔ اس عالم نو میں "سرور و نور کا کوثر" لٹایا جاتا ہے "شباب و حسن کی بجلیوں" کو لہرانے کا اذن دیا جاتا ہے۔ اور "ناز کی بستیاں" بسائی جاتی ہیں۔ ایک تخیّل لطیف سے لطف اٹھائیے ؎

زمیں پر بھیج دے آج اے بہشت اپنی بہاروں کو
بچھا دے خاک پر اے آسماں اپنے ستاروں کو
خرام و رقص کا دے حکم فطرت ابر پاروں کو
وہ بے خود چاند کی نظروں سے گھبرائے گی وادی میں
سنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں

جذبات کی دنیا میں جو چیز سب سے زیادہ پُراثر ہے۔ وہ درد (Pathos) ہے۔ درد سب سے زیادہ لطیف ہے اور یہ قلب و روح کے عمیق ترین مقام میں آسودہ رہتا ہے۔ درد کا اظہار یک بیک اُبل پڑنے والے چشمے کی طرح ہوتا ہے۔ جو زمین کے سینے سے پھوٹ بہتا ہے۔ درد قلب حیات کی محبوب ترین حس ہے۔ نازک، ناقابل بیان۔ لذیذ اور پُر اسرار!

اختر کی شاعری اس آسمانی جذبے سے یکسر خالی تو نہیں۔ مگر اس کے جلوے عریاں نظر نہیں آتے جب اختر زندگی کے اصلی سوز و درد سے متاثر ہوتا ہے تو صرف اس کے حواس سوز و درد سے کراہتے ہیں۔ روح تلملا نہیں اٹھتی۔ اختر کا دل سوزش عشق سے صرف جلا شعلہ ساماں ہوا۔ مگر نہ وہ پگھل سکا۔ نہ جل کر خاکستر ہوا۔ پھر بھی اختر کی گزارش "اے عشق کہیں لے چل" "او دیس سے آنے والے بتا" اور "جہاں ریحانہ رہتی تھی" کے بعض مقامات تاثیر درد کے کرشمے دکھلاتے ہیں۔ سنئے ؎

قسم ان آنسوؤں کی جو بہائے تھے کبھی تم نے
ستارے وہ جو آنکھوں سے گرائے تھے کبھی تم نے
شروع عشق کی بے تابیوں کی ہے قسم تم کو
شبانِ ہجر کی بے خوابیوں کی ہے قسم تم کو
فقط اتنا بتا دو کیا وہ باتیں پھر نہ آئیں گی ؟
وہ راتیں، آہ وہ راتیں، وہ راتیں پھر نہ آئیں گی ؟

~~~~~~~~

پیامِ دردِ دل اختر دیئے جاتا ہوں وادی کو
سلامِ رخصتِ غمگیں کئے جاتا ہوں وادی کو
سلام اے وادیٔ ویراں جہاں ریحانہ رہتی تھی !

ختم کلام پر مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اردو کی رومانی شاعری کے دورِ ثانی سے ہم اس قدر قریب ہیں کہ نقد و نظر کا حق پورے طور پر ادا نہیں ہو سکتا۔ فاصلۂ نظر کا بہت ہی کم ہونا بھی اس کے دور ہو جانے کی طرح فریب دہ ہے۔ انتہائی قربت اشیاء کی جسامت کو بڑھا بھی دیتی ہے اور ایک حد کے بعد بصارت کو مجہول بھی کرتی ہے۔ آئندہ آنے والے لوگ ہم سے بہتر طور پر اس فرض کو ادا کر سکیں گے۔

~~~~~~~~

جب وادیٔ گل کے شعرستاں پر خاموشی چھا جاتی ہے

جب لیلیٰ شب کی زلفِ سیہ، سینے تک لہرا جاتی ہے

جب موج ہوائے ساحل کو، نشّوں بھری نیند آجاتی ہے

جب چاندنی دشت و گلشن میں موتی سے برسا جاتی ہے

جب زمزمہ زارِ ہستی اک ہو کی بستی ہو جاتا ہے !

جب نیند کی گہری مستیوں میں سارا عالم سو جاتا ہے !

تب وادی کی کمسن کلیوں تک زہرہ کی شعاعیں آتی ہیں
اور ان کے رنگ و بو کے رسیلے پردوں میں بس جاتی ہیں
پھر شبنم بوسے لیتی ہے، مستی کی بہاریں چھاتی ہیں
اور ماہوشانِ کاہکشاں، گلہائے طلا برساتی ہیں

جس وقت یہ سب رنگینیاں اس وادی میں یکجا ہوتی ہیں!
تب کلیوں کے رنگیں پہلو سے کچھ حوریں پیدا ہوتی ہیں!

پھر حوریں یہ ساری، مل جل کر اک نغمۂ رنگیں گاتی ہیں
اور دائرے کی سی صورت میں سب رقص اپنا دکھلاتی ہیں
ایک ایک حریری جنبش سے جنّت کے سمے برساتی ہیں
اور وادی ماہ و انجم کے نظاروں کو شرماتی ہیں

سنسان فضا میں نغموں کا اک طوفان بپا ہو جاتا ہے!
ویران ہوا میں رقص کا اک ہیجان بپا ہو جاتا ہے!

یوں رات بھراں کے مست ترانے جھومتے ہیں گلزاروں پر
اور رات بھراں کا رقصِ بہاریں تیرتا ہے کہساروں پر
شاداب و حسیں رعنائیاں سی چھائی رہتی ہیں تاروں پر
اک حشر سا نور و نکہت کا رہتا ہے بپا نظاروں پر

جب صبح کو سورج کی کرنیں مشرق سے اُبھر کر آتی ہیں!
تب شرم کی ماری یہ کلیوں کے پردوں میں چھپ جاتی ہیں!

خوش آمدید

شملے وہ ماہِ رواں آنے کو ہے — اس زمیں پر آسماں آنے کو ہے

بہرِ پابوسی بڑھا ابرِ بہار — وہ بہارِ گل فشاں آنے کو ہے

جس سے تھی مہکی ہوئی وادیٔ سندھ — آج وہ بوئے رواں آنے کو ہے

دامنِ بحرِ عرب کی کر کے سیر — میری سلمائے جواں آنے کو ہے

وادیٔ شملہ نہ ہو مغرور کیوں — اک ستارہ میہماں آنے کو ہے

وہ ہے زہرہ اور شملہ آسماں — زہرہ سوئے آسماں آنے کو ہے

وہ ہے اک چاند اور شملہ کہکشاں — چاند سوئے کہکشاں آنے کو ہے

وہ ہے اک حور اور شملہ اک جناں — حور پھر سوئے جناں آنے کو ہے

وہ ہے اک سرو اور شملہ گلستاں — سرو سوئے گلستاں آنے کو ہے

وہ ہے اک پھول اور شملہ باغباں — پھول سوئے باغباں آنے کو ہے

جس کے قدموں پر فدا جانِ جہاں — آج وہ جانِ جہاں آنے کو ہے

زندگانی سے کہو، فانی ہے کیوں؟ — نورِ حسنِ جاوداں آنے کو ہے

ماہ و انجم سے کہو، سجدے کریں! — وہ ملائک آستاں آنے کو ہے

طوطیانِ شملہ ہوں شکّر شکن — بلبلِ شیریں زباں آنے کو ہے

شاعرانِ شہر سے جا کر کہو — مبدا الہام جواں آنے کو ہے

چشمِ انجم نے نہ دیکھا تھا جو حسن — آج وہ حسنِ رواں آنے کو ہے

اُس کا استقبال کرنے کے لئے — دولتِ ہر دو جہاں آنے کو ہے

اُس کا فرشِ راہ بننے کے لئے — خاک پر پھر کہکشاں آنے کو ہے

گرد رہ سے پاک کرنے کے لئے — گیسوئے حورِ جناں آنے کو ہے

پائے تمکیں اُس کے دھونے کے لئے — سلسبیلِ زرفشاں آنے کو ہے

کیوں نہ شمشاد و صنوبر سر جھکائیں | آج وہ سروِ رواں آنے کو ہے
جا کے وادی میں بچھا دوں فرشِ گل | وہ سراپا پرنیاں آنے کو ہے
چولٹ تا ہے بہارِ رنگ و بو | پھر وہی ابرِ رواں آنے کو ہے
مستیاں سی ہیں فضا میں منتظر | اُس کی بوئے دلستاں آنے کو ہے
سندھ کے ساحل پہ لہراتا ہوا | رنگ و بو کا کارواں آنے کو ہے
دامنِ وادی کو مہکاتی ہوئی | اک نسیمِ گل فشاں آنے کو ہے
شاخِ گل جھک کر نہ کیوں سجدے کرے | وہ بتِ نازک میاں آنے کو ہے
رنگ و بو کی داستاں کہئے جسے | وہ مجسم داستاں آنے کو ہے
لعل لب، دیں نذر، گلہائے چمن | وہ گلِ شیریں دہاں آنے کو ہے

بے خودی میں کیوں نہ اختر جان دے
آج وہ جانِ جہاں آنے کو ہے!!

اے عشق ہمیں برباد نہ کر!

اے عشق نہ چھیڑ آ آ کے ہمیں، ہم بھولے ہوؤں کو یاد نہ کر!
پہلے ہی بہت ناشاد ہیں ہم، تو اور ہمیں ناشاد نہ کر!
قسمت کا ستم ہی کم نہیں کچھ، یہ تازہ ستم ایجاد نہ کر!
یوں ظلم نہ کر، بیداد نہ کر!
اے عشق ہمیں برباد نہ کر!

جس دن سے ملے ہیں دونوں کا، سب چین گیا، آرام گیا
چہروں سے بہارِ صبح گئی، آنکھوں سے فروغِ شام گیا
ہاتھوں سے خوشی کا جام چھٹا، ہونٹوں سے ہنسی کا نام گیا
غمگیں نہ بنا، ناشاد نہ کر!
اے عشق ہمیں برباد نہ کر!

راتوں کو اٹھ اٹھ کر روتے ہیں، رو رو کے دعائیں کرتے ہیں

آنکھوں میں تصور، دل میں خلش، سر دھنتے ہیں آہیں بھرتے ہیں

اے عشق! یہ کیا روگ لگا، جیتے ہیں نہ ظالم مرتے ہیں

یہ ظلم تو اے جلاد نہ کر!

اے عشق ہمیں برباد نہ کر!

یہ روگ لگا ہے جب سے ہمیں، رنجیدہ ہوں میں، بیمار ہے وہ

ہر وقت تپش، ہر وقت خلش، بیخواب ہوں میں بیدار ہے وہ

جینے سے ادھر بیزار ہوں میں، مرنے پہ ادھر تیار ہے وہ

اور ضبط کی فریاد نہ کر!

اے عشق ہمیں برباد نہ کر!

جس دن سے بندھا ہے دھیان ترا گھبرائے ہوئے سے رہتے ہیں

ہر وقت تصور کر کر کے شرمائے ہوئے سے رہتے ہیں

کملائے ہوئے پھولوں کی طرح کملائے ہوئے سے رہتے ہیں

پامال نہ کر، برباد نہ کر!

اے عشق ہمیں برباد نہ کر!

بیدرد! ذرا انصاف تو کر! اس عمر میں اور مغموم ہے وہ!

پھولوں کی طرح نازک ہے ابھی، تاروں کی طرح معصوم ہے وہ!

یہ حسن، ستم! یہ رنج، غضب! مجبور ہوں میں! مظلوم ہے وہ!

مظلوم پہ یوں بیداد نہ کر!

اے عشق ہمیں برباد نہ کر!

اے عشق خدارا دیکھ کہیں، وہ شوخ حسیں بدنام نہ ہو!

وہ ماہ لقا بدنام نہ ہو، وہ زہرہ جبیں بدنام نہ ہو!

ناموس کا اس کے پاس رہے، وہ پردہ نشیں بدنام نہ ہو!

اس پردہ نشیں کو یاد نہ کر!

اے عشق ہمیں برباد نہ کر!

اُمید کی جھوٹی جنّت کے، رہ رہ کے نہ دکھلا خواب ہمیں!
آئندہ کی فرضی عشرت کے، وعدوں سے نہ کر بیتاب ہمیں!
کہتا ہے زمانہ جس کو خوشی، آتی ہے نظر کمیاب ہمیں!
چھوڑ ایسی خوشی کو یاد نہ کر!
اے عشق ہمیں برباد نہ کر!

کیا سمجھے تھے اور تو کیا نکلا، یہ سوچ کے ہی حیران ہیں ہم!
ہے پہلے پہل کا تجربہ اور کم عمر ہیں ہم، انجان ہیں ہم!
اے عشق! خدارا رحم و کرم! معصوم ہیں ہم، نادان ہیں ہم!
نادان ہیں ہم، ناشاد نہ کر!
اے عشق ہمیں برباد نہ کر!

وہ راز ہے یہ غم آہ جسے، پا جائے کوئی تو خیر نہیں!

آنکھوں سے جب آنسو بہتے ہیں، آ جائے کوئی تو خیر نہیں!
ظالم ہے یہ دنیا، دل کو یہاں، بھا جائے کوئی تو خیر نہیں!
ہے ظلم، مگر فریاد نہ کر!
اے عشق، ہمیں برباد نہ کر!

وہ دن ہی میں عہدِ طفلی کے، معصوم زمانے بھول گئے!
آنکھوں سے وہ خوشیاں مٹ سی گئیں، لب کو وہ ترانے بھول گئے!
اُن پاک بہشتی خوابوں کے، دلچسپ فسانے بھول گئے!
ان خوابوں سے یوں آزاد نہ کر!
اے عشق ہمیں برباد نہ کر!

اُس جانِ حیا کا بس نہیں کچھ، بے بس ہے پرائے بس میں ہے
بے درد دلوں کو کیا ہے خبر، جو پیار یہاں آپس میں ہے
ہے بے بسی زہر اور پیار ہے رس، یہ زہر چھپا اس رس میں ہے

کہتی ہے حیا فریاد نہ کر!
اے عشق ہمیں برباد نہ کر!

آنکھوں کو یہ کیا آزار ہوا، ہر جذبِ نہاں پر رو دینا!
آہنگِ طرب پر جھک جانا، آوازِ فغاں پر رو دینا!
بربط کی صدا پر رو دینا، مطرب کے بیاں پر رو دینا!

احساس کو غم بنیاد نہ کر!
اے عشق ہمیں برباد نہ کر!

ہر دم ابدی راحت کا سماں دکھلا کے ہمیں دلگیر نہ کر!
للہ حبابِ آبِ رواں پر نقشِ بقا تحریر نہ کر!
مایوسی کے رمتے بادل پر امید کے گھر تعمیر نہ کر!

تعمیر نہ کر، آباد نہ کر!
اے عشق ہمیں برباد نہ کر،

جی چاہتا ہے اک دوسرے کو یوں آٹھ پہر ہم یاد کریں!
آنکھوں میں بسائیں خوابوں کو، اور دل میں خیال آباد کریں!
خلوت میں بھی ہو جلوت کا سماں، وحدت کو دوئی سے شاد کریں!

یہ آرزوئیں ایجاد نہ کر!
اے عشق ہمیں برباد نہ کر!

دنیا کا تماشا دیکھ لیا، غمگین سی ہے، بے تاب سی ہے!
امید یہاں اک وہم سی ہے، تسکین یہاں اک خواب سی ہے!
دنیا میں خوشی کا نام نہیں، دنیا میں خوشی نایاب سی ہے!

دنیا میں خوشی کو یاد نہ کر!
اے عشق ہمیں برباد نہ کر!

ساقی اُٹھ تلوار اُٹھا

{ یونان کے ایک رند مگر محبِّ وطن
شاعر کے نقطۂ نظر سے }

پھر امن کی رنگیں وادی سے ھنگامۂ گیر و دار اُٹھا
دنیائے سکوں کے پہلو میں سر فتنۂ حشر آثار اُٹھا
ہستی کے بہاریں مطلع پر پھر ابرِ شرارہ بار اُٹھا

بیکار ہیں چنگ و تار اٹھا!
اُٹھ ساقی اٹھ تلوار اُٹھا!

پھر کارگہِ انسانی پر خونخواری و وحشت پھیلی ہے
افضائے زمیں ہے فتنوں سے پُر اور فتنوں کی ہیبت پھیلی ہے
یزداں کی حکومت مٹ سی گئی، شیطاں کی حکومت پھیلی ہے

پھر غلغلۂ تاتار اُٹھا!
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اُٹھا!

پھر طبل و غا کا شور ہؤا، آفاق کے ایواں کانپ اُٹھے
پھر باغ و گلستاں کانپ اُٹھے، پھر دشت و خیاباں کانپ اُٹھے
صحرا و قہستاں کانپ اُٹھے، دریا و بیاباں کانپ اُٹھے۔

آوازۂ گیر و دار اُٹھا!
اُٹھ ساقی اٹھ تلوار اُٹھا!

مغرب کی فضائے بحری سے طوفاں کی صدائیں آتی ہیں
یا جوِّ ہوا میں مرگ و ہلاکت کی پریاں لہراتی ہیں

اور برق و شرر کے سازوں پر اک نغمۂ خونیں گاتی ہیں

پھر صلصلہ پیکار اٹھا!
اُٹھ ساقی اٹھ تلوار اُٹھا!

سربازوں کے جنگی نعروں سے پھر ساحل و میداں گونجتے ہیں
طیاروں کی آتشباری سے ہامون و کہستاں گونجتے ہیں
دریاؤں کی تہ میں موتوں کے بپھرے ہوئے طوفاں گونجتے ہیں

یا دیو شرارہ خوار اٹھا!
اُٹھ ساقی اٹھ تلوار اُٹھا!

سن وقت کی آواز آتی ہے وہ دورۂ غفلت ختم ہوا
ساغر کو اُلٹ، بربط کو اٹھا، ہنگامۂ عشرت ختم ہوا
جانبازی کی ساعت آپہنچی، رویائے محبت ختم ہوا

ہیں جام و سبو بیکار اٹھا!

اُٹھ ساقی اُٹھ تلوار اٹھا!

پہلو سے ہٹا دے دستۂ گل، ہنگام بہاراں رخصت ہے!
نظروں میں ہے نقشہ میداں کا، تزئین گلستاں رخصت ہے
پھر صبح قیامت آ پہنچی، پھر لطفِ شبستاں رخصت ہے

پھر مہر قیامت بار اُٹھا!
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا!

دشمن ہے قریب اور خطرے میں ہے ماہ لقائے آزادی
دل میرا نثار آزادی، جاں میری فدائے آزادی
اٹھ جلد کہ غاصب چھین نہ لیں ہاتھوں سے لوائے آزادی

وہ ہلہلۂ یلغار اٹھا!
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا!

غیرت، کہ عدو کے نرغے میں ہے خاک وطن، بستان وطن

ناپاک قدم سے غیروں کے آلودہ نہ ہو میدان وطن
یہ عمرِ جواں گلکارِ وطن، یہ عشقِ حسین قربان وطن

پھر ولولۂ پیکار اٹھا!
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا!

وہ دیکھ، وطن کی سرحد پہ دشمن کے عساکر چھانے لگے
موجوں کی طرح بل کھانے لگے، طوفاں کی طرح لہرانے لگے
دامانِ افق سے طیارے آگ اور دھواں برسانے لگے

یا ابرِ سرکہسار اٹھا!
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا!

ہم مست ہیں لیکن تیغ بکف میدان میں جانے والے ہیں
اعدائے وطن کے سینوں پہ بجلی سی گرانے والے ہیں
اور اُن کے وطن میں اُن کی جگہ فریادیں بسانے والے ہیں

یہ چنگ ہٹا، یہ تار اٹھا!
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا!

دشمن کا لہو پینا ہے ہمیں رہنے دے مئے گلفام نہ دے
تلوار اٹھانے والوں کے ہاتھوں میں چھلکتا جام نہ دے
صہبا کی جگہ رقصاں ہے لہو، مستی کا فریب خام نہ دے

یہ جام مئے گلنار اٹھا!
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا!

ناموس وطن کو غیروں کے پنجے سے بچانے جاتے ہیں
مدت سے ہیں پیاسی تلواریں پیاس ان کی بجھانے جاتے ہیں
دشمن کی تڑپتی لاشوں کا کھیل ان کو دکھانے جاتے ہیں

لا برق فنا آثار اٹھا!
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا!

وہ دیکھ، اُس اُونچی چوٹی سے جو دُور، دکھائی دیتی ہے
لیلائے وطن کی دردبھری آواز سنائی دیتی ہے
جو اُڑتے ہوئے پرچم کے تلے رو رو کے دہائی دیتی ہے

سن، حشر بر کہسار اٹھا!
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا!

میں رک نہیں سکتا جاؤں گا اور دھوم مچاتا جاؤں گا
بربط کی طرح ان وادیوں میں تلوار بجاتا جاؤں گا
اس ساز حسیں پر حب وطن کے نغمے سناتا جاؤں گا

بربط کو ہٹا، ہتیار اُٹھا!
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا!

اٹھ، نام و شرف کی موت اچھّی، بے نام و شرف کے جینے سے!
ہے خونِ عدو پینے میں سوا لذت مئے سادہ پینے سے

بپھری ہوئی اک مستانہ صدا آتی ہے فضا کے سینے سے

پھر ہمہمۂ سرشار اٹھا!
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا!

پھر چشم براہ جرأت ہے لیلائے شہادت میداں میں
شاداب ہوا کرتی ہے سدا ہر قوم کی عظمت میداں میں
تلواروں کی خونیں بارش سے کھل جاتی ہے جنّت میداں میں

گلہائے طرب کا ہار اٹھا!
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا!

بجلی کی طرح رگ رگ میں رواں پھر عشق نہانِ ملّت ہے
شیرانہ سوئے جنگاہ دواں ایک ایک جوانِ ملّت ہے
اور قومی نشاں میں بال فشاں پھر شوکت و شانِ ملّت ہے

وہ رایتِ عظمت بار اٹھا!

اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا!

خاموش کر اپنے بربط کو خوابوں کا اثر ہر تار میں ہے
وہ لطف کہاں اس ساز میں جو تلوار کی اک جھنکار میں ہے
ہنگامۂ قتل و غارت کا ارمان دلِ سرشار میں ہے

یہ بربطِ راحت بار اٹھا!
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا!

ہشیار، کہ ہو جائے نہ کہیں پامالِ خزاں، گلزارِ وطن
گلہائے ارم سے بڑھ کے ہمیں محبوب ہے اک اک خارِ وطن
گہوارۂ ماہ و انجم ہے رفعت کدۂ کہسارِ وطن

پھر دل میں سرِ پندار اٹھا!
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا!

مانا کہ کوئی ذرہ بھی یہاں، آزادِ غمِ ایّام نہیں

قابو میں کسی کے صبح نہیں، قبضے میں کسی کے شام نہیں
پر عشقِ وطن کے ماروں کا مرنے کے سوا کچھ کام نہیں

آنکھیں ہوئیں کیوں خوں نبار اٹھا!
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا!

نذرِ وطن

نذرِ وطن، پھر اے دلِ دیوانہ چاہیے ، پھر ہر قدم پہ سجدۂ شکرانہ چاہیے

پھر سرزمیں وطن کی ہے نظروں کے سامنے پھر لب پہ ایک نعرۂ مستانہ چاہیے

بچپن کی یاد لیتی ہے پھر دل میں چٹکیاں پھر بے خودی میں بہجتِ طفلانہ چاہیے

برسوں کے بعد آئے ہیں باغِ وطن میں ہم پھر ہر کلی کو سجدۂ مستانہ چاہیے

کہسارِ سبز پوش نظر آئے دُور سے پھر لب پہ چار بیت کا افسانہ چاہیے

پھر جا رہے ہیں میکدۂ حُسن کی طرف پھر ہر قدم پہ لغزشِ مستانہ چاہیے

جس کوچے میں ہوئیں کبھی رسوائیاں نصیب — اُس کا طواف، اے دلِ دیوانہ چاہیے

بخشا تھا جس نے پہلے پہل دل کو دردِ عشق — پھر اُس کے در پہ سجدۂ شکرانہ چاہیے

مدت کے بعد سامنے ہوگی وہ شمع رو — پھر دل کو سوزشِ پر پروانہ چاہیے

پھر دل کو ہو یقیں نہ کسی کے وصال کا — پھر واقعہ بصورتِ افسانہ چاہیے

پھر شوق سے ملیں گے کسی گلعذار سے — پھر لب پہ شورِ بلبلِ مستانہ چاہیے

جھولا جھلائیں گے کسی مستِ شباب کو — رقصاں فضا میں پھر مئے و میخانہ چاہیے

پائے طلب کو وادیٔ پروین ہے نیم گام — پھر آرزو کو منزلِ جانانہ چاہیے

پھر خرمنِ سکوں کو ہیں درکار بجلیاں — پھر بے حجاب، جلوۂ جانانہ چاہیے

پھر ذوقِ مے کشی کو ہے معراج کی طلب — کوثر کا بادہ، چاند کا پیمانہ چاہیے

پھر شوق بن کے دل میں دھڑکتی ہے زندگی — پھر جنبشِ تبسمِ جانانہ چاہیے

پھر سینۂ امید میں رقصاں ہے برقِ طور — پھر پرسشِ مذاقِ کلیمانہ چاہیے

بالائے کوہ سایۂ ابرِ بہار میں — پروین و ماہتاب کا کاشانہ چاہیے

پھر اس حریم نور کے آغوش ناز میں
اک گلکدہ برنگ پرستانہ چاہیئے

پھر ابر و باغ و نکہت و گل کے ہجوم میں
شمع و سرود و بادہ و پیمانہ چاہیئے

پھر اس کی چشم مست پہ گیسو ہوں پرفشاں
پھر ابر شام گوں سر میخانہ چاہیئے

پھر چاندنی میں دامن دریا پہ اے ندیم
رقص شراب و گردش پیمانہ چاہیئے

جوش طرب نے حشر سا دل میں کیا بپا
پھر بے خودی کو گریۂ مستانہ چاہیئے

اختر، وطن میں آکے کھلا یہ حسین راز
اس مختصر سی عمر میں کیا کیا نہ چاہیئے!

زباں خامہ سے پھر گل کھلانے کی تمنا ہے
کہ اک گلرخ نے پوچھا ہے "تمہارا شغل اب کیا ہے؟"

پریشاں حالیاں، اِس پرسشِ احوال کے قرباں
مرا ہر شعر، اس کی زلف کے ہر بال کے قرباں

مری چشمِ حزیں اس دلربا تحریر کے صدقے
دلِ دیوانہ، اس مشکیں ادا زنجیر کے صدقے

حسیں الفاظ میں جذبوں کا اک طوفان پنہاں ہے
اثر سے جس کے، دل میں چلبلیوں کا جوشِ رقصاں ہے

جبینِ بندگی آمادہ ہے سجدے لٹانے کو
زبانِ شوق مضطر ہے سرودِ عشق گانے کو

دلِ مضطر کو ارماں ہے مچل کر خامہ بن جائے
تمنّا کو یہ حسرت ہے اُبل کر نامہ بن جائے

جنوں کہتا ہے پندارِ جنوں کی انتہا کر دوں
مہ و انجم کو اُس کے پائے نازک پر فدا کر دوں

جوانی مضطرب ہے شوق کا اظہار کر آؤں
اور اُس بلقیس وش کے گیسوؤں کو پیار کر آؤں

محبّت مسکراتی ہے کہ ان کا سامنا ہو گا
تو دل ہی کو نہیں، دونوں جہاں کو تھامنا ہو گا

جنونِ بے خودی بس کر کہ عرضِ داستاں کر لوں
حضورِ حسن میں کچھ مشغلہ اپنا بیاں کر لوں!

ادب سے جا کے کہنا اے صبا اس شوخ پُر فن سے

کہ رومان اور محبّت مشغلہ ہے میرا بچپن سے!

محبّت کے لئے آیا ہوں میں دنیا کی محفل میں

محبّت خون بن کر کھلاتی ہے مرے دل میں

ھر اک شاعر، مقدر اپنا اپنے ساتھ لایا ہے

محبّت کا جنوں تنہا مرے حصّے میں آیا ہے

محبّت ابتدا میری، محبّت انتہا میری

محبّت سے عبارت ہے بقا میری، فنا میری

محبّت آرزو میری، محبّت جستجو میری

محبّت خامشی میری، محبّت گفتگو میری

محبّت ہی مرے نزدیک معراجِ عبادت ہے

محبّت ہی مرے نزدیک سرتاجِ عبادت ہے

محبّت مبتدا میرا، محبّت منتہا میرا
حقیقت میں محبّت ہی محبّت ہے خدا میرا

محبّت ہی مری طاقت، محبّت ہی جوانی ہے
محبّت گر نہ ہو، ویران میری زندگانی ہے

محبت میری دولت ہے، محبّت میری عظمت ہے
محبّت ہی سے مصرِ شعر پر میری حکومت ہے

محبّت کتنی ہی بے مایہ ہو، شاہانہ رہتی ہے
خراب آباد دل میں صورتِ سلطانہ رہتی ہے

محبّت ہی سے روشن جلوہ زارِ کبریائی ہے
محبّت جس کو کہتے ہیں حقیقت میں خدائی ہے

شب و روز، اک نیا پیغام لاتے ہیں محبّت کا!
گل و انجم، مجھے نغمہ سناتے ہیں محبّت کا!

سحر کی حور جب زلفِ سمن پر گنگناتی ہے
محبت رنگ و بو ہو کر فضا میں پھیل جاتی ہے
سرِ کہسار جب مستانہ بادل گھر کے آتے ہیں
محبت کے حسیں اور خوشنما موتی لٹاتے ہیں
جہاں مہتاب جب سطحِ فلک پر جگمگاتا ہے
محبت کی حسین و مرمریں کرنیں لٹاتا ہے
عروسِ شام شرماتی ہے جب دن کے نظاروں سے
محبت نیچی نظریں بن کے گرتی ہے ستاروں سے!
سحر دم جب گھنی شاخوں میں چڑیاں چہچہاتی ہیں
محبت کی جہانگیری کے شیریں گیت گاتی ہیں!
محبت ہی نے مجھ کو درسِ گل چینی سکھایا ہے!
اور اک مدت سے اپنے باغ کا مالی بنایا ہے!

ودائع شب، اٹھا لاتا ہے پائیں باغ میں مجھکو
ستارہ صبح کا پاتا ہے پائیں باغ میں مجھکو

سحر خیزی مری، پھولوں کو بیداری سکھاتی ہے
مری آمد نوا سنجانِ گلشن کو جگاتی ہے!

خوشی کی بے خودی بے حدّ و بے اندازہ ہوتی ہے
فضاؤں سے لپٹ جانے کی حسرت تازہ ہوتی ہے

اور اس کے بعد میں ہوتا ہوں اور وجدان کا عالم
محبّت شاعری، احساس اور ہیجان کا عالم!

مزا آتا ہے وہ رنگِ گل و آہنگِ بلبل میں
سحر سے شام کر دیتا ہوں اکثر گوشۂ گل میں

ہجومِ گل میں کھو جاتی ہیں اکثر چاندنی راتیں
مری معبود ہو جاتی ہیں اکثر چاندنی راتیں

چمن کے مست نظارے مجھے مسرور رکھتے ہیں
مرے دل کو گدازِ نغمہ سے معمور رکھتے ہیں

اسیرِ کیف کر دیتی ہے یہ پھولوں کی آبادی
مجھے خوشبو سے بھر دیتی ہے یہ پھولوں کی آبادی!

شرابِ رنگ و بُو ایسی برستی ہے نظاروں سے
لپٹ جاتا ہوں جوشِ بےخودی میں شاخساروں سے

ھر اک لمحہ چمن کا نشہ بن بن کر گذرتا ھے
کہ ھر پھول اور ستارہ جامِ مستی پیش کرتا ہے

اسی عالم میں یاد آتی ہیں کچھ ہنستی ہوئی راتیں!
جوانی کی بہاروں کا لہو پیتی ہوئی راتیں!

گذشتہ زندگی دھراتے ہیں یہ چاند، یہ تارے
سمے بچپن کے پھر دکھلاتے ہیں یہ چاند یہ تارے

کہانی سی کوئی دہراتی ہیں یہ چاندنی راتیں
کہاں سے جاکے پھر لوٹ آتی ہیں یہ چاندنی راتیں؛

وہی ہیں چاند تارے اب بھی اور ویسی ہی رات اب بھی!
مرا بچپن، نہیں، باقی وہی ہے کائنات اب بھی!

مجھے جب یادِ ماضی، حال سے بیزار کرتی ہے؛
تو مستقبل کی امید آکے دل کو پیار کرتی ہے!

میں کھو جاتا ہوں آئندہ مسرت کے خیالوں میں
خوشی کا رنگ بھر دیتا ہوں ماضی کے ملالوں میں!

محبت کی سی، کوئی چیز پیدا دل میں ہوتی ہے
ستارے توڑ لانے کی تمنا دل میں ہوتی ہے

خوشی کے جذبے طوفاں سے بسا جاتے ہیں سینے میں
زمین و آسماں آکر سما جاتے ہیں سینے میں

مگر اک دل، سمندر کا نشیمن بن نہیں سکتا!
ذرا سا قطرہ طوفانوں کا مسکن بن نہیں سکتا!

مرا دل ڈوبنے لگتا ہے اس انبارِ ارماں سے
یہ کشتی تہہ نشیں ہو جاتی ہے ٹکرا کے طوفاں سے!

میں اس دھن میں مکان و لامکاں کو بھول جاتا ہوں
خیالِ گلستاں میں گلستاں کو بھول جاتا ہوں

غرض کیا پوچھتی ہو مشغلہ الفت کے ماروں سے؟
یہ وحشی کھیلتے رہتے ہیں پھولوں سے بہاروں سے!

اور

اور اس وحشت میں چنتے پھرتے ہیں ہم پھول گلشن میں!
صبا شاید گرا دے جا کہ، ان کو تیرے دامن میں!

فراق

حیراں ہے آنکھ جلوۂ جاناں کو کیا ہُوا

حیراں ہے آنکھ جلوۂ جاناں کو کیا ہُوا
ویراں ہیں خواب گیسوئے رقصاں کو کیا ہُوا؟

قصرِ حبیب خموش ہے ایوان پر سکوت
آواز ہائے سروِ خراماں کو کیا ہُوا؟

پردوں سے روشنی کی کرن پھوٹتی نہیں
اُس شمع رنگ و لَو کے شبستاں کو کیا ہُوا؟

دنیا سیاہ خانۂ غم بن رہی ہے کیوں
اللہ! میرے ماہِ خراماں کو کیا ہُوا؟

طوفاں اٹھا رہی ہیں مرے دل کی دھڑکنیں
اُس دستِ نرم و ساعدِ لرزاں کو کیا ہُوا؟

ناداں آنسوؤں کو ہے مدت سے جستجو
آرام گاہِ گوشۂ داماں کو کیا ہُوا؟

سیراب کاریٔ لبِ گلگوں کدھر گئی
ہیں تشنہ کام ساغرِ جاناں کو کیا ہُوا؟

کشتِ مراد ہو چلی نذرِ سمومِ غم
یارب نمودِ ابرِ خراماں کو کیا ہُوا؟

رونا ہے بات بات پہ یُوں زار زار کیوں؟
اخترؔ خبر نہیں دلِ ناداں کو کیا ہُوا؟

ساقی سے

(عالمِ رقص و نغمہ میں)

اٹھ ساقیِ گلفام، اٹھا پھول، اڑا پھول!
بے تاب ہیں مے خوار، پلا پھول، لٹا پھول!
ہاں پھول کھلا پھول

اٹھ پھول اٹھا پھول ——— لا پھول پلا پھول!

دنیا کے ستم بھول، زمانے کے الم بھول!
فریاد و فغاں کس لئے سنسار کے غم بھول!
غم بھول، اڑا پھول

اٹھ پھول اٹھا پھول ——— لا پھول پلا پھول!

مینا کی طرف گام بڑھا، گام بڑھا، گام!

لا جام بڑھا، جام بڑھا، جام بڑھا، جام!

اور جام میں لا پھول!

اٹھ پھول اٹھا پھول ——————— لا پھول پلا پھول!

دل سرد ہے، دل سرد ہے، دل سرد ہے دنیا

بیدرد ہے بیدرد ہے، بیدرد ہے دنیا

عشرت کے کھلا پھول!

اٹھ پھول اٹھا پھول ——————— لا پھول کھلا پھول!

"تاروں سے مرصع ہو مئے ناب کا ساغر

ناہید کا پیمانہ ہو، مہتاب کا ساغر

ساغر میں کھلا پھول!

اٹھ پھول اٹھا پھول ——————— لا پھول پلا پھول!

خاتمۂ جنگ

سامانِ بہار و طرب و رنگ کا دن ہے
افسوں گریِ ساز و نے و چنگ کا دن ہے
دورِ مے و نوشِ لبِ گلرنگ کا دن ہے
لا جام کہ پھر نکہت و آہنگ کا دن ہے
اٹھ، ساقیہ اٹھ، خاتمۂ جنگ کا دن ہے!

کیا کیا نہ کیا تنگ غم و کرب و بلا نے
کیا کیا نہ مظالم کئے اربابِ جفا نے

آخر سنی مظلوموں کی فریاد خدا نے
پھر امن کے نغماتِ خوش آہنگ کا دن ہے
اٹھ ساقیہ اٹھ خاتمۂ جنگ کا دن ہے!

جرمن ہوں کہ جاپانی ہوں، برباد ہوئے سب
جو ملک تھے قبضے میں، وہ آزاد ہوئے سب
سُن کر خبرِ فتح کو دل شاد ہوئے سب
لا بادہ کہ پھر بادۂ افرنگ کا دن ہے
اٹھ ساقیہ اٹھ خاتمۂ جنگ کا دن ہے!

آزاد بلا ہو گئی لیلائے تمدّن!
پھر جلوہ نما ہے رُخِ زیبائے تمدّن!
لبریزِ مئے امن ہے مینائے تمدّن!
لا بھر کے گلابی، مئے افرنگ کا دن ہے

اٹھ، اے ساقیہ اٹھ! خاتمۂ جنگ کا دن ہے

پھر مطلع عالم سے چھٹے جنگ کے بادل
اللہ کی رحمت سے گھٹے جنگ کے بادل
پھر مشرق و مغرب سے ہٹے جنگ کے بادل
پھر فتح کا دن "فاتحۂ" جنگ کا دن ہے!
اٹھ، اے ساقیہ اٹھ! خاتمۂ جنگ کا دن ہے!
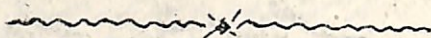
گلبانگِ قفس

مدّت سے نہ آئی کوئی خبر، یارانِ گلستاں کیسے ہیں؟
اے بادِ صبا، اتنا تو بتا سرو و گل و ریحاں کیسے ہیں؟

پابندِ قفس تو کیسے کہیں اور کس سے کہیں رودادِ قفس
آزادِ قفس بتلائیں ہمیں، اربابِ گلستاں کیسے ہیں؟

ہر ایک قدم یاں محبسِ غم، ہر تازہ ستم اِک مصرِ الم
اس حال میں پوچھیں کس سے یہ ہم غمدیدۂ کنعاں کیسے ہیں؟

ہمدرد ہے اپنا کون یہاں؟ لا تو ہی خبر اے بادِ خزاں!
اس سال وطن کے باغوں میں گلہائے بہاراں کیسے ہیں؟

غربت ہی نہ تھی کم ہوشربا، اُس پر یہ اسیری بنج فزا
ہے کون جو پوچھے آکے ذرا، ہم خستہ حرماں کیسے ہیں؟

صیاد نے ہے چن چن کے کیا، بے جرم و خطا محبوس بلا
ہے کس کو غرض جو پوچھے ذرا، آبادیٔ زنداں کیسے ہیں؟

اے موجِ نسیمِ صبحِ چمن، خوش باش، سنا پھر حالِ وطن!
کہسار و دمن کس حال میں ہیں، وادی و خیاباں کیسے ہیں؟

کیا پوچھتی ہے اے شامِ قفس، افسانۂ رنگ و بوئے چمن!
ہم قیدیوں کو کیا علم کہ اب گل کیسے، گلستاں کیسے ہیں؟

گلبانگِ قفس ہی بن جائے، اے کاش نوائے آزادی
کیا کہئے کہ اخترؔ سینے میں مچلے ہوئے ارماں کیسے ہیں؟

آمدِ بہار

ہے فصلِ گرما قریبِ رخصت، فضائے عالم بدل رہی ہے

خیال ہوتا ہے بزمِ فطرت اک اور سانچے میں ڈھل رہی ہے

حسین چہروں پہ اب پسینے سے غازہ کم چھوٹنے لگا ہے

سیاہ زلفوں کی چھاؤں میں پھر شگفتگی سی مچل رہی ہے

بہار آنے لگی ہے راتوں پہ، کیف بن بن کے رفتہ رفتہ

برنگِ مہتاب، حورِ فطرت ادا سے رنگت بدل رہی ہے

ہوا میں سردی سی آ چلی ہے، فضا پہ مستی سی چھا چلی ہے

جوان راتوں کے گیسوؤں سے بہارِ تازہ اُبل رہی ہے

صبا جب آتی ہے گلستاں سے شبِ بہاراں کے کہکشاں سے

یہی گماں ہوتا ہے جہاں سے، پری فطرت نکل رہی ہے

گداز ہونے لگا ہے پیدا سحر کے مستانہ منظروں سے

بہار کی روشنی سی بن بن کے روحِ انساں پگھل رہی ہے

یہ مست و مخمور رات اختر، یہ جانفزا کائنات اختر

اِدھر نظارے لٹا رہی ہے، اُدھر ستارے اُگل رہی ہے
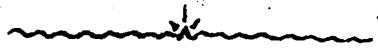
پاؤں زخمی ہونے پر

یارب اول تو مرے زخم نہ آیا ہوتا
شدتِ درد نے اتنا نہ ستایا ہوتا

یا یہ صورت تھی مناسب کہ مرا قلبِ حزیں
دردِ احساس سے تو نے نہ بنایا ہوتا

گر یہ ممکن نہ تھا یارب تو مرے سینے میں
میرا دل اپنا نہیں بلکہ پرایا ہوتا

یہ بھی مشکل تھا الٰہی تو مرے پاؤں کا زخم
ساتھ تیمور کی تقدیر بھی لایا ہوتا

یہ بھی امید سے بڑھ کر ہے تو میرے معبود!
بائرن ہی کا سا حاصل مجھے پایا ہوتا

اور اگر زخم ہی آنا تھا بہر رنگ تو یہ
ملک کے واسطے میدان میں آیا ہوتا

میداں کی آرزو

گل کی ہے آرزو نہ گلستاں کی آرزو — سینے میں حشر خیز ہے میداں کی آرزو

مردوں کو مطرب و مے و مینا سے کام کیا — ہے تیر و تیغ و خنجرِ برّاں کی آرزو

ہے بارِ گوش، زمزمۂ سازِ دل نواز — بیتاب کن ہے نعرۂ میداں کی آرزو

ساقی سے مطلب اور نہ میخانے سے غرض — سرباز کو ہے تیغہ و پیکاں کی آرزو

کم ہمتوں سے کہہ دو کہ آئیں نہ میرے ساتھ — ہے مجھ کو جنگِ رستم و دستاں کی آرزو

ہو سیلِ میکدہ کا اثر ہم پہ کیا مجال — لرزاں ہے دل میں خون کے طوفاں کی آرزو

پھولوں سے کھیلنے کا زمانہ گذر گیا — ہے دل کو جورِ خارِ مغیلاں کی آرزو

اخترؔ کے نام میں بھی اثر "شیر" کا ہے پھر
کیوں ہو نہ جنگِ شیرِ نیستاں کی آرزو

بڑھے چلو!

(ایک جنگی ترانہ)

دلاورانِ تیغ زن بڑھے چلو، بڑھے چلو!
بہادرانِ صف شکن، بڑھے چلو، بڑھے چلو!
یلانِ زلزلہ فگن، بڑھے چلو، بڑھے چلو!
غضنفرانِ پیل تن، بڑھے چلو، بڑھے چلو!

دلاورانِ تیغ زن، بڑھے چلو، بڑھے چلو!
بہادرانِ صف شکن، بڑھے چلو، بڑھے چلو!

سنو سنو کہ وقت کا کچھ اور ہی پیام ہے!
اٹھو اٹھو کہ خطرے میں وطن کا ننگ و نام ہے
بڑھو بڑھو کہ غازیوں کو بڑھنے ہی سے کام ہے!
برنگِ جہلم و چمن، بڑھے چلو، بڑھے چلو!

دلاورانِ تیغ زن، بڑھے چلو، بڑھے چلو!
بہادرانِ صف شکن، بڑھے چلو، بڑھے چلو!

رکو نہیں جو دشت و ریگ زار آئیں سامنے!
بچو نہیں جو سیل و جوئبار آئیں سامنے!
ہٹو نہیں، جو جسر و کوہسار آئیں سامنے!
ہو راہ کتنی ہی کٹھن، بڑھے چلو، بڑھے چلو!

دلاورانِ تیغ زن، بڑھے چلو، بڑھے چلو!
بہادرانِ صف شکن، بڑھے چلو، بڑھے چلو!

بڑھو کہ ڈھل چلا ہے دن، قریب وقتِ شام ہے!
افق کے دستِ زرد میں شفق کا سرخ جام ہے!
سوادِ غرب کو رواں مہرِ تیز گام ہے!
بڑھی شعاعِ ضو فگن، بڑھے چلو، بڑھے چلو!

دلاورانِ تیغ زن، بڑھے چلو، بڑھے چلو!
بہادرانِ صف شکن، بڑھے چلو، بڑھے چلو!

اٹھو، کہ رزمگہ ہے پھر تمہارے انتظار میں!
تڑپ رہی ہیں بجلیاں فضائے شعلہ کار میں!
ہیں مضطرب شجاعتیں، سوادِ کارزار میں!
مثالِ برقِ شعلہ زن، بڑھے چلو، بڑھے چلو!

دلاورانِ تیغ زن، بڑھے چلو، بڑھے چلو!
بہادرانِ صف شکن، بڑھے چلو، بڑھے چلو!

بجا کہ راہ پُرخطر ہے اور اندھیری رات ہے!
مگر تمہاری پاسباں، خدا کی پاک ذات ہے!
اُسی کے اختیار میں حیات اور ممات ہے!
کرو نہ فکرِ جان و تن، بڑھے چلو، بڑھے چلو!

دلاورانِ تیغ زن، بڑھے چلو، بڑھے چلو!
بہادرانِ صف شکن، بڑھے چلو، بڑھے چلو!

تمہاری تیغِ تیز پر وطن کو افتخار ہے!
وطن کی مرگ و زیست کا تمہیں پہ انحصار ہے!
تمہیں ہو جن کے دل میں، اس کا عشق بیقرار ہے!
لگائے دل میں یہ لگن، بڑھے چلو، بڑھے چلو!

دلاورانِ تیغ زن، بڑھے چلو، بڑھے چلو!
بہادرانِ صف شکن، بڑھے چلو، بڑھے چلو!

اٹھاؤ تیغِ بے اماں، وطن کے پاک نام پر!
لٹا دو عمرِ نوجواں، وطن کے پاک نام پر!
نثار کر دو اپنی جاں، وطن کے پاک نام پر!
صدائیں دیتا ہے وطن، بڑھے چلو، بڑھے چلو!

دلاورانِ تیغ زن، بڑھے چلو، بڑھے چلو!
بہادرانِ صف شکن، بڑھے چلو، بڑھے چلو!

وطن کی عظمتِ کہن، دکھا دو اس جہاں کو پھر!
بدل دو اپنی ٹھوکروں سے گردشِ زماں کو پھر!
ہلا دو اس زمیں کو پھر، جھکا دو آسماں کو پھر!
برنگِ ابرِ نعرہ زن، بڑھے چلو، بڑھے چلو!

دلاورانِ تیغ زن، بڑھے چلو، بڑھے چلو!
بہادرانِ صف شکن، بڑھے چلو، بڑھے چلو!

اگرچہ سام و تہمتن، زمانے سے گذر گئے!
مگر سپاہیانہ زندگی سے نام کر گئے!
بڑھو، کہ کوئی کہہ نہ دے یلانِ ہند ڈر گئے!
مثالِ سام و تہمتن، بڑھے چلو، بڑھے چلو!

دلاورانِ تیغ زن، بڑھے چلو، بڑھے چلو!
بہادرانِ صف شکن، بڑھے چلو، بڑھے چلو!

سنو، کہ آج خطرے میں، وطن کا نام و ننگ ہے!
اٹھو، کہ چرخِ نیل فام کا کچھ اور رنگ ہے!
چلو، کہ راہ سخت ہے، بڑھو کہ وقت تنگ ہے!
بھلا کے فکرِ ما و من، بڑھے چلو، بڑھے چلو!

دلاورانِ تیغ زن، بڑھے چلو، بڑھے چلو!
بہادرانِ صف شکن، بڑھے چلو، بڑھے چلو!

بجا ہے یہ کہ سخت و صعب رہ گذار آئیں گے!
درست ہے کہ وشت و راغ و ریگزار آئیں گے!
صحیح ہے جبال و قلعہ و حصار آئیں گے!
جبیں پہ ہو نہ اک شکن، بڑھے چلو، بڑھے چلو!

دلاورانِ تیغ زن، بڑھے چلو، بڑھے چلو!
بہادرانِ صف شکن، بڑھے چلو، بڑھے چلو!

تمہارے دم قدم ہی سے ہے شان و شوکتِ وطن!
تمہاری تیغ تیز ہے نشانِ غیرتِ وطن!
تمہی ہو عزّتِ وطن، تمہی ہو عظمتِ وطن!
بڑھائے عظمتِ وطن، بڑھے چلو، بڑھے چلو!

دلاورانِ تیغ زن، بڑھے چلو، بڑھے چلو!
بہادرانِ صف شکن، بڑھے چلو، بڑھے چلو!

تمہارے نعروں سے سوادِ کارزار کانپ اٹھے!
فضائے دشت تھرتھرائے، کوہسار کانپ اٹھے!
ہر ایک قلعہ گونج اٹھے، ہر اک حصار کانپ اٹھے!
مثالِ بحرِ جوشزن، بڑھے چلو، بڑھے چلو!

دلاورانِ تیغ زن، بڑھے چلو، بڑھے چلو!
بہادرانِ صف شکن، بڑھے چلو، بڑھے چلو!

سپاہیانہ زندگی جو قسمتِ سعید ہے!
تو رزمگہ کی موت بھی سپاہیانہ عید ہے!
جیا تو فخرِ قوم ہے، مرا تو وہ شہید ہے!
سروں سے باندھ کر کفن بڑھے چلو، بڑھے چلو!

دلاورانِ تیغ زن، بڑھے چلو، بڑھے چلو!
بہادرانِ صف شکن، بڑھے چلو، بڑھے چلو!

سوادِ جنگ کہہ رہا ہے، تیغ کا اشارہ پھر!
وطن کی خاک دیکھتی ہے خونفشاں نظارہ پھر!
افق پہ جگمگا رہا ہے فتح کا ستارہ پھر!
بفضلِ ربِّ ذوالمنن، بڑھے چلو، بڑھے چلو!

دلاورانِ تیغ زن، بڑھے چلو، بڑھے چلو!
بہادرانِ صف شکن، بڑھے چلو، بڑھے چلو!
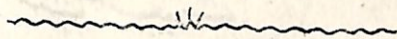
بادل

دھوم سی مچ گئی، کس دھوم سے آئے بادل ساری دنیا کی فضاؤں پہ ہیں چھائے بادل

دل کو بھائے مری آنکھوں میں سمائے بادل

سال بھر بعد بہاروں کے یہ دن پھر آئے شوخ و شاداب نظاروں کے یہ دن پھر آئے

سال بھر بعد، پھر اس رنگ سے آئے بادل

بادل آئے، بھری برسات کے ساماں لائے اپنے دامن میں بہاروں کے شبستاں لائے

گل و گلشن کے لئے تازگی لائے بادل

کیف و سرمستی سے یوں جھومتے کیوں آئے ہیں باغ و کہسار کا منہ چومتے کیوں آئے ہیں

کیا کسی شوخ کا پیغام ہیں لائے بادل

یہ سماں دیکھ کے دل اپنا بھر آتا ہے کسی گلرخ کا تصوّر ہمیں تڑپاتا ہے

اختر اس حال میں ہم کو نہ ستائے بادل

برکھارُت

گھٹاؤں کی نیل فام پریاں، اُفق پہ دھومیں مچا رہی ہیں
ہواؤں میں تھرتھرا رہی ہیں، فضاؤں کو گدگدا رہی ہیں

چمن شگفتہ، دمن شگفتہ، گلاب خنداں، سمن شگفتہ
بنفشہ و نسترن شگفتہ ہیں، پتیاں مسکرا رہی ہیں

یہ مینہ کے قطرے مچل رہے ہیں، کہ ننھے ننھے ستارے ڈھل رہے ہیں
افق سے موتی ابل رہے ہیں، گھٹائیں موتی لٹا رہی ہیں

بہارِ ہندوستاں یہی ہیں، ہماری فصلوں کی جاں یہی ہیں
بہشت کو نذر نشاں یہی ہیں، جو بدلیاں دل لبھا رہی ہیں

نہیں ہے کچھ فرق بحر و بر میں، کھنچا ہے نقشا یہی نظر میں
کہ ساری دنیا ہے اک سمندر، بہاریں جس میں نہا رہی ہیں

چمن ہے رنگیں، بہار رنگیں، مناظرِ سبزہ زار رنگیں
ہیں وادی و کوہسار رنگیں، کہ بجلیاں رنگ لا رہی ہیں

چمن میں اختر بہار آئی، لہک کے صوتِ ہزار آئی
صبا گلوں میں پکار آئی، اٹھو گھٹائیں پھر آ رہی ہیں

ننّھا قاصد

ترا ننّھا سا قاصد، جو ترے خط لے کر آتا تھا

نہ تھا معلوم اُسے کس طرح کے پیغام لاتا تھا ؛

سمجھ سکتا نہ تھا وہ خط میں کیسے راز پنہاں ہیں ؛

حروفِ سادہ میں کس حشر کے انداز پنہاں ہیں ؟

اُسے کیا علم ان رنگیں لفافوں میں چھپا کیا ہے ؛

کسی مہوش کا ان کے بھیجنے سے مدّعا کیا ہے ؛

مگر مجھ کو خیال آتا تھا اکثر اس زمانے میں
کہ اُس کی حیرتِ طفلی ہے کیوں گم اس فسانے میں؛
وہ با ایں کم سنی، کیا یہ نہ دل میں سوچتا ہوگا؛
کہ "باجی نے ہماری" اپنے خط میں کیا لکھا ہوگا؛
"اور آخر وہ اسی کو نامہ لکھ کر بھیجتی کیوں ہیں؛
"کبھی بھیجا تو بھیجا لیکن اکثر بھیجتی کیوں ہیں؛
"وہ پہلے سے زیادہ بھائی کو کیوں پیار کرتی ہیں؛
"لطف فرد ے کے لطفِ خاص کا اظہار کرتی ہیں"
پھر ایسے "اجنبی" پر اُس کی باجی" مہرباں کیوں ہیں؛
"اگر ہیں بھی تو گھر والوں سے یہ باتیں نہاں کیوں ہیں؛
اور اُس کے شبہے کی، اس سے بھی تو تائید ہوتی ہے
چھپا کر خط کو لے جانے کی کیوں تاکید ہوتی ہے؛

"یہ نوخیز اجنبی جانے کہاں سے اکثر آتا ہے"

"جب آتا ہے تو باجی کی طرح خط لکھ کے لاتا ہے"

"عزیزوں کی طرح یہ کیوں، مکاں میں آ نہیں سکتا؟"

جب اُس سے پوچھتا ہے، وہ اسے سمجھا نہیں سکتا!

کھلونے دے کر اُس کو، مسکرا دیتا ہے وہ اکثر

اور اک ہلکا سا تھپڑ بھی لگا دیتا ہے وہ اکثر!

ترے قاصد کے یہ افکار، دل کو گدگداتے تھے

اور اپنے بھولپن سے میرے جذبوں کو ہنساتے تھے

نہیں موقوف اُنھی ایّام پر، جب بھی خیال آیا،

تصوّر، تیرے بعد اُس کا بھی نقشا سامنے لایا!

مگر آج اس طرح دیکھا ہے وہ نقشِ جبیں میں نے

کہ رکھ دی خاکِ حیرت پر محبّت کی جبیں میں نے

وہی ننھا سا قاصد نوجواں ہو کر ملا مجھکو
زمانے کے تغیّر نے پریشاں کر دیا مجھکو

جنونِ ابتدائے عشق نے کروٹ سی لی دل میں
پس از مدت، یہ لیلےٰ آ گئی پھر اپنے محمل میں!

ترے قاصد سے ملتے وقت مجھ کو شرم آتی تھی
مگر اُس کی نگاہوں میں شرارت مسکراتی تھی

شرارت کا یہ نظّارہ مری حیرت کا ساماں تھا!
کہ اُس پردے کے اندر تیرا رازِ عشق عُریاں تھا!

ایک پیغام

(پایئں باغ سے)

میرے چمن کی فضا، تم کو یاد کرتی ہے! — بہار اور اس کی ہوا تم کو یاد کرتی ہے!

ہر ایک پھول ہے مضطر، گلے لگانے کو — ہر اک کلی کی ادا تم کو یاد کرتی ہے!

جو چھیڑتی تھی تمہاری طلائی زلفوں کو — وہی شریر صبا تم کو یاد کرتی ہے!

بسی ہوئی ہے جو اب تک تمہاری خوشبو سے — وہی مہکتی ہوا تم کو یاد کرتی ہے!

چمن میں سر کو اٹھائے، شجر ہیں چشم براہ — افق پہ مست گھٹا تم کو یاد کرتی ہے!

ہر ایک شاخ کی زربفتی سرسراہٹ میں — نسیمِ نغمہ سرا تم کو یاد کرتی ہے!

وہ جس سے اب بھی جھلکتی ہے عہدِ رفتہ کی یاد — وہ بلبلوں کی نوا تم کو یاد کرتی ہے!

جو گدگداتی ہے بچپن کے خواب بن بن کر — وہ بادلوں کی صدا تم کو یاد کرتی ہے!

بہارِ رفتہ کی یادوں کا جو پرستاں ہے
وہ منظروں کی ادا تم کو یاد کرتی ہے!

تمہاری اوڑھنی بچپن میں ہو گئی تھی جو گم
وہ آج بن کے گھٹا تم کو یاد کرتی ہے!

وہ قمریوں کے ترانے، وہ کوئلوں کی پکار
وہ صبح اور وہ صبا تم کو یاد کرتی ہے!

گزار دیتے تھے ہم جس کی گود میں راتیں
وہ چاندنی وہ ضیا تم کو یاد کرتی ہے!

جو پردہ بن کے گرا کرتی تھی شبستاں پر
وہ مشک فام گھٹا تم کو یاد کرتی ہے!

وہ جس کے خوف سے اک دن تلاشِ پہلو تھی
وہ سرد سرد ہوا تم کو یاد کرتی ہے!

نسیم صبح کی اٹھکیلیوں کے پردے میں
کسی کی "شوخ" دعا تم کو یاد کرتی ہے!

تم ایک دن جسے سمجھی تھیں میرے غم کا غرور
وہ آنسوؤں کی حیا، تم کو یاد کرتی ہے!

جفائے ناز کی عادت سہی، تمہیں لیکن
مری غریب وفا، تم کو یاد کرتی ہے!

ہے جس کی آرزو، اختر کو مدتوں سے مگر
ہوئی نہیں جو "خطا"، تم کو یاد کرتی ہے!

فریبِ ہستی

"ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے!"

(غالب)

زندگیِ گزراں، عمرِ رواں کچھ بھی نہیں — ساقیہ، جام کہ بنیادِ جہاں کچھ بھی نہیں!

اعتبارات پہ قائم ہے نظامِ ہستی — یہ زمیں کچھ بھی نہیں دورِ زماں کچھ بھی نہیں!

ایک امیدِ خیالی پہ جیے جاتے ہیں — ورنہ بنیادِ حیاتِ گزراں کچھ بھی نہیں!

کاکلِ دوست کا ہے ایک فریبِ رنگیں — ورنہ یہ سلسلۂ دورِ زماں کچھ بھی نہیں!

نکہت و ناز و ادائے حسیناں، موہوم! — کاکل و دیدۂ دلبہائے بتاں کچھ بھی نہیں!

زہرہ و ماہ و ثریا ہیں نگاہوں کی جھلک — آب جو، نکہتِ گل، بادِ وزاں کچھ بھی نہیں!

لالۂ و یاسمن و گل ہیں، بہاروں کا فریب — سبزۂ و گلکدۂ و جوئے رواں کچھ بھی نہیں

سرو و شمشاد و صنوبر، ہیں نظر کا دھوکا — شاخسار و چمن و آبِ رواں، کچھ بھی نہیں

رنگِ زیبائشِ رنگیں بدناں لاحاصل — طرزِ آرائشِ گل پیرہناں، کچھ بھی نہیں!

شفق آرائیٔ لعلِ لبِ میگوں، بیکار — غالیہ سائیٔ گیسوئے بتاں، کچھ بھی نہیں!

میکدہ کاریٔ چشم و نظر، اک موجِ سراب — ارغواں زاریٔ رخسار و دہاں، کچھ بھی نہیں!

مطربِ کمسن و آہنگِ کہن، سب بے معنی! — ساغرِ کہنہ و ساقیٔ جواں، کچھ بھی نہیں!

بزمِ اسکندر و کاؤس ہے، لایعنی شے — تختِ منقد و نیہ و تاجِ کیاں، کچھ بھی نہیں!

حسنِ نو کچھ بھی نہیں، عشقِ جواں کچھ بھی نہیں
ہوش اے دل، کہ جہانِ گذراں کچھ بھی نہیں

بلبلِ زار ہے فریاد و فغاں پر مجبور — گرچہ مستقبلِ فریاد و فغاں، کچھ بھی نہیں!

ایک مستیٔ ابد ہے رگ و پے میں ساری — دل کی نظروں میں خراباتِ جہاں کچھ بھی نہیں!

ایک موہوم سی منزل کی طرف ہیں راہی — زہرہ و ماہ و نجومِ گذراں، کچھ بھی نہیں!

اس زمانے میں ہیں ایمان و وفا خوابِ کہن
یہ حقیقت بھی نہاں ہے تو عیاں، کچھ بھی نہیں!

اور یہی چیز ہے جو دل میں اتر جاتی ہے
نطقِ بیتاب و لبِ شعلہ چکاں، کچھ بھی نہیں!

اور بھی "بخششیں" ہیں مسجد میں عبادت کے سوا
اور صنم خانوں میں جز حسنِ بتاں، کچھ بھی نہیں!

زندگی ہی میں جو حاصل نہ ہو وہ کیا نعمت
وادیٔ کوثر و گلزارِ جناں، کچھ بھی نہیں!

ایک ٹھوکر سے اڑا دیتے ہیں تختِ جم و کے
گو فقیرانِ درِ پیرِ مغاں، کچھ بھی نہیں!

رات دن کشمکشِ رنج و الم ہے برپا
جان ہی کو نہ ہو راحت تو جہاں کچھ بھی نہیں!

سبزۂ گور کی جنبش سے صدا آتی ہے
یہ جہاں آہ، جہانِ گزراں، کچھ بھی نہیں!

کوئی شاداب حقیقت ہے تو ہے بزمِ مغاں
ورنہ اختر یہ جہانِ گزراں، کچھ بھی نہیں!

طلوعِ محبت سے پہلے

جب تلک دل میں محبت نہ ہوئی تھی پیدا

یہ زمیں سادہ تھی، جنت نہ ہوئی تھی پیدا
زندگی میں کوئی لذت نہ ہوئی تھی پیدا
ذہن اور فکر میں عظمت نہ ہوئی تھی پیدا
جب تلک، دل میں محبت نہ ہوئی تھی پیدا

میرے افکار کے پھولوں میں بہار آئی نہ تھی
میرے اشعار میں رنگینی و رعنائی نہ تھی
میری تخئیل میں ندرت نہ ہوئی تھی پیدا
جب تلک دل میں محبّت نہ ہوئی تھی پیدا

بے اثر تھی، مری نظروں میں ستاروں کی بہار
کتنی افسردہ تھی قدرت کے نظاروں کی بہار
کسی منظر میں لطافت نہ ہوئی تھی پیدا
جب تلک دل میں محبّت نہ ہوئی تھی پیدا

آرزوئیں تھیں نہ یہ حُسن بھرا خواب اُن کا
نہ اُمنگیں تھیں نہ یہ نشۂ شاداب اُن کا
کسی جذبے میں طراوت نہ ہوئی تھی پیدا
جب تلک دل میں محبّت نہ ہوئی تھی پیدا

یہ جہاں سادہ تھا، بے کیف تھا یا غمزدہ تھا
ایک اک ذرہ پریشان تھا، ماتم زدہ تھا
باغ ہستی میں مسرّت نہ ہوئی تھی پیدا
جب تلک دل میں محبّت نہ ہوئی تھی پیدا

نہ گھٹاؤں میں تھا یہ رنگِ خراماں پہلے
نہ ہواؤں میں تھی یہ بوئے پرافشاں پہلے
رنگ و بُو میں یہ حلاوت نہ ہوئی تھی پیدا
جب تلک دل میں محبّت نہ ہوئی تھی پیدا

حسن خنداں تھا نہ دیوانے نظر آتے تھے
شمع روشن تھی نہ پروانے نظر آتے تھے
یہ جنوں اور یہ وحشت نہ ہوئی تھی پیدا
جب تلک دل میں محبّت نہ ہوئی تھی پیدا

مصرِ افکار تھا بیگانہ زلیخاؤں سے
میرے ارماں کدے محروم تھے سلماؤں سے
فکر اور شعر میں لذّت نہ ہوئی تھی پیدا
جب تلک دل میں محبّت نہ ہوئی تھی پیدا

شیریں آئی تھی نہ ایراں کی فضا سے اب تک
کوئی بلقیس نہ اٹھی تھی سبا سے اب تک
اور سلیماں کی عظمت نہ ہوئی تھی پیدا
جب تلک دِل میں محبّت نہ ہوئی تھی پیدا

اے ابرِ رواں

اے ابرِ رواں، جا سوئے وطن، جا سوئے وطن، اے ابرِ رواں!

اور چوم آ جا کر روئے وطن، ابروئے وطن، اے ابرِ رواں!

دامن میں چھپا لا، بوئے وطن، خوشبوئے وطن، اے ابرِ رواں!

اے ابرِ رواں جا سوئے وطن، جا سوئے وطن، اے ابرِ رواں!

اے ابرِ رواں

اے ابرِ رواں، میرا غمِ دل، یارانِ وطن کو جا کے سُنا!

اے بلبلِ دشتِ غربت کا افسانہ چمن کو جا کے سُنا!
ہر سنبل و گل کو جا کے سُنا، ہر سرو و سمن کو جا کے سُنا!
اے ابرِ رواں جا سوئے وطن، جا سوئے وطن اے ابرِ رواں!

اے ابرِ رواں!

کہنا کہ دیارِ غربت میں اک غمزدہ روتا رہتا ہے!
دن رات تمہاری فرقت میں منہ اشکوں سے دھوتا رہتا ہے!
گلہائے سخن کو آنسوؤں کے تاروں میں پروتا رہتا ہے!
اے ابرِ رواں، جا سوئے وطن، جا سوئے وطن اے ابرِ رواں

اے ابرِ رواں!

کہنا کہ وطن سے ہو کے جدا، ہم سیرِ گلستاں کھو بیٹھے
وہ صحنِ چمن، وہ جلوۂ مہ، وہ حسنِ بہاراں کھو بیٹھے
وہ شوخیٔ گل، وہ رنگِ سمن، وہ نکہتِ ریحاں کھو بیٹھے

اے ابرِ رواں جا سوئے وطن، جا سوئے وطن، اے ابرِ رواں!

اے ابرِ رواں!

کہنا کہ ہر اک راحت سے یہاں، بیگانہ سے ہیں، مجبور سے ہیں!
قابو میں نہیں ہے یاد تری، اے خاکِ وطن! مجبور سے ہیں!
غمگین سے ہیں، غمدیدہ سے ہیں، رنجیدہ سے ہیں، رنجور سے ہیں!
اے ابرِ رواں جا سوئے وطن، جا سوئے وطن، اے ابرِ رواں!

اے ابرِ رواں!

پھر بہار آئی ہواؤں کو گُل افشاں کر دیں
ساغرِ حُسن و گل و نغمہ کو رقصاں کر دیں

سوز و سازِ دلِ بے تاب کو ارزاں کر دیں
ایک شعلے سے جہاں بھر میں چراغاں کر دیں

گل و گلشن کو مے و میکدہ ساماں کر دیں
حُسنِ نوشابۂ بینائی کو عُریاں کر دیں!

نرگس و زھرہ و مہتاب کو حیراں کر دیں
باغ میں ساغرِ گل پوش کو رقصاں کر دیں
شاہد و شمع کو دیں حکمِ چمن آرائی
نغمہ و نور، بہم دست و گریباں کر دیں
رامش و رنگ کو بخشیں سر و برگِ معراج
نکہت و نازکی پریوں کو پرافشاں کر دیں
راحت و راح و رباحین کے صنم خانے میں
مے و مستی و مسیحائی کو ارزاں کر دیں
پھول کے بدلے کہیں شاخ پہ جام آویزاں
ساغروں کی جگہ پھولوں کو فروزاں کر دیں
شاخساروں پہ ہوں ناہید و شبیں، نغمہ فشاں
اس ادا سے کہ عنادل کو بھی حیراں کر دیں

پھول برسائیں درختوں سے چمن رو، ہر سو
ایسی شوخی سے کہ ناروں کو پریشاں کر دیں

بامِ اشجار پہ بھی مست نوا ہوں، گل رخ
اس حلاوت سے کہ بلبل کو غزل خواں کر دیں

شمع و فانوس سے آراستہ ہوں نخل و شجر
لالہ و گل کی بہاروں کو نمایاں کر دیں

سبزے کے فرش پہ گل در بر و ساغر در کف
ساقیانِ سمن اندام کو رقصاں کر دیں

شمع رو، ناز سے صف بستہ ہوں بزمِ گل میں
سرو و ریحاں کی فضاؤں میں چراغاں کر دیں

دستِ ہر غنچہ میں اک جامِ طلائی رکھ دیں
کفِ ہر جام کو پھولوں سے گلستاں کر دیں

سایۂ زلف میں چہروں کو فروزاں کر کے
وادیٔ ابر میں انجم کو درخشاں کر دیں

ایک اک بال میں شبنم کے پروئیں موتی
زلف کے شبکدے میں نور کا ساماں کر دیں

مرمریں سینے ہوں گلہائے شفق گوں سے عیاں
ارغواں زار میں زوشن بستاں کر دیں

کبھی اس بت کا گلِ عارضِ رنگیں چھو لیں
کبھی اس شوخ کی زلفوں کو پریشاں کر دیں

مائلِ بندہ نوازی ہوں گل اندام ایسے
کہ خدائی میں خدائی کو بھی آساں کر دیں

ساغرِ گل میں پئیں بادۂ گلگوں پیہم
اس لطافت سے کہ غنچوں کو بھی خنداں کر دیں

مطلعِ جام سے لہرا کے خوشی کی بجلی
غم کو موجِ مئے گلرنگ میں پنہاں کر دیں

چھیڑ کر حور وشانِ حرمِ صومعہ کو
لالہ رویانِ خرابات کو خنداں کر دیں

مے ہر رنگ ہو، ہر رنگ سے طلعت افشاں
بند شیشوں میں شگفتہ گل و ریحاں کر دیں

دل سے دارا و سکندر کے بھلا دیں قصّے،
اس طرح رونقِ جام کو رقصاں کر دیں

عظمتِ فقر کے رخشندہ جمالوں کی قسم
ذرّے ذرّے کو حریفِ مہِ تاباں کر دیں

بے نوایانِ درِ پیرِ مغاں کو ہمدم
قیصرِ عالم و شاہنشہِ دوراں کر دیں

کر کے تقسیم، زرِ انجم و سیم مہتاب
دستِ مفلس کی طرح، چرخ کو ویراں کر دیں

بے نیازی سے نہ دیکھیں، جم و کسریٰ کی طرف
بے رخی سے، ہتکِ خسرو و خاقاں کر دیں

ایک سلطان کو کشکولِ گدائی دے کر
ہر گدا کو کئی معموروں کا سلطاں کر دیں

ایک کیخسرو و خاقاں سے حکومت لے کر
کئی محتاجوں کو کیخسرو و خاقاں کر دیں

منتظر عالمِ نو کا ہے جہانِ کہنہ
شب تیرہ سے عیاں، صبحِ درخشاں کر دیں

عدل کے نام سے یہ ظلم نہ ہوں دنیا میں
مورِ کمزور کو ہمتائے سلیماں کر دیں

شیخ کعبہ کو سزا دیں یہ ریا کاری کی
جام در کف کسی بُت خانے میں رقصاں کر دیں

برہمن کو دیں یہ انعام شر انگیزی کا
کہ مقرر کسی مسجد کا نگہباں کر دیں

شہرت آئے تو اُسے بھیج دیں زاہد کی طرف
ہوس آئے تو کسی پیر پہ احساں کر دیں

دولت آئے تو اسے بھیج دیں سوئے مفلس
ذلّت آئے تو رواں جانبِ سلطاں کر دیں

حوریں آئیں تو اُنہیں بخش دیں ہم واعظ کو
کوثر آئے تو سوئے کعبہ خراماں کر دیں

قیس کی بے کسیِ جوشِ جنوں کے بدلے
لیلےٰ نجد کو رسوائے بیاباں کر دیں

وامقِ رنج رسیدہ کے سکوں کی خاطر
مثلِ گیسو، دلِ عذرا کو پریشاں کر دیں

دستِ فرہاد کے زخموں پہ رکھیں یوں مرہم
لبِ شیریں کو پُر از شورِ نمکداں کر دیں

انتقامِ خلشِ قلبِ زلیخا کے لئے
پارہ پارہ، مہِ کنعاں کا گریباں کر دیں

غیرت اے مے طلبی، المدد اے تشنہ لبی!
جامِ خالی سے بپا نوح کا طوفاں کر دیں!

جن سے برسات کی راتوں میں برستی ہے شراب
اُن گھٹاؤں کو فضاؤں میں خراماں کر دیں

مریم توبہ گر اس بزم میں آنا چاہے
خیمہ مقدم کے لئے وا، درِ عصیاں کر دیں

زلفِ شب بڑھنے نہ دیں تا بہ کمرِ حشر تلک
اور بڑھے تو اُسے شانوں پہ پریشاں کر دیں
صبح کو بار نہ دیں تا ابد اس محفل میں
یا مقدر، درِ گلزار کا درباں کر دیں
اس طرح اس ارمِ خواب نما میں اخترؔ
اپنے افکار کی عذراؤں کو عریاں کر دیں

ایک خط

اے رُوحِ قرارِ بیقراراں! سامانِ سکونِ دلفگاراں!
اے مرکزِ انتظارِ آغوشش! عیدِ نگہ و بہارِ آغوشش!
اے لالہ رُخ و چمن تماشا! رشکِ گل و یاسمن تماشا!
اے صبحِ بہار و شامِ مہتاب! اے خوابِ شباب و عشقِ شاداب!
اے رونقِ نوبہارِ بستر! اے طالعِ کامگارِ بستر!
اے جشنِ گہِ سعیدِ پہلو! نوروزِ نگاہ و عیدِ پہلو!
مدت سے نہ لی خبر ہماری! حسرت زدہ ہے نظر ہماری!
اے جانِ عزیز و روحِ محبوب! عرصے سے نہ خط لکھا نہ مکتوب!
پہلے تو یہ بے رخی نہیں تھی! الطاف میں یوں کمی نہیں تھی!
محرومِ کرم نہ تھا دلِ زار پامالِ الم نہ تھا دلِ زار!

آخر کو یہ کج ادائیاں کیوں؟ ہم سے یہ بے اعتنائیاں کیوں؟

اے جانِ بہار و روحِ گلشن! محروم ہے کیوں نظر کا دامن؟

دیدار کو دل ترس رہا ہے آنکھوں سے لہو برس رہا ہے

اے ماہ رخ و ستارہ اندام! نیندیں ویراں ہیں راتیں ناکام

صدمے ہم جھیلتے ہیں شب بھر انگاروں سے کھیلتے ہیں شب بھر

اے روکشِ مہر و رشکِ مہتاب دن کو مضطر ہیں شب کو بیخواب

کیوں ہو گئیں اس طرح خفا تم رہنے لگیں ہم سے کیوں جدا تم؟

کیوں بھول گئیں، وفا کے انداز سیکھے کس سے جفا کے انداز؟

دل ہجر میں خون ہو رہا ہے بادل کی طرح سے رو رہا ہے

اب بھی جو ترس نہ کھاؤ گی تم!

زندہ ہم کو نہ پاؤ گی تم!

بستی کی لڑکیوں کے نام

ایک شہری شاعر کا پیغام

اے صبا، گر بگذری بر ساحلِ رودِ ارس !!
بوسہ زن بر خاکِ آں وادی و مشکیں کن نفس !

چل اے نسیمِ صحرا، زوحِ رُوانِ صحرا ! — میرا پیام لے جا، سوئے بتانِ صحرا !

صحرائی مہوشوں کی خدمت میں جا کے کہنا — بھولے نہیں تمہیں ہم، اے دخترانِ صحرا !

گر بس چلے تو آئیں اور دردِ دل سُنائیں — تم کو گلے لگائیں، ہم پھر میانِ صحرا !

تم "نجد" میں پریشاں، شہر و غمیں ہم ہیں حیراں — اللہ کی اماں ہو تم پر بتانِ صحرا !

تم اُس طرف غموں سے بے حال ہو رہی ہو ! — ہم اس طرف ہیں مضطر، دامن کشانِ صحرا !

ہم پاس آئیں کیونکر، تم کو بلائیں کیونکر ؟ — یہ دُکھ مٹائیں کیونکر، واماندگانِ صحرا !

بے تاب ہیں الم سے، بیخواب رنج و غم سے — کیا پوچھتی ہو ہم سے، اے دلبرانِ صحرا!

تم یاد کر رہی ہو، بیداد کر رہی ہوا — برباد کر رہی ہو، اے گلرخانِ صحرا!

یہ کیا کہا کہ "تم ہو رنگینیوں کے خوگر"! — غمگیں ہیں تم سے بڑھ کر، اے غم کشانِ صحرا!

یہ رات یہ گھٹائیں، یہ شور یہ ہوائیں، — بچھڑے ہوئے ملیں گے کیونکر، میانِ صحرا!

شہروں کی زندگی سے ہم تنگ آ چکے ہیں — صحرا میں پھر بلا لو، اے ساکنانِ صحرا!

"بادِ سموم" ہو یا "صرصر" کے تند طوفاں" — ڈرتے نہیں کسی سے دلدادگانِ صحرا!

آبادیوں میں حاصل، آزادیاں نہیں ہیں — آجاؤ تم ہی اُڑ کر، او طائرانِ صحرا!

صحرا کی وسعتوں میں ہم کو نہ بھول جانا — او دخترانِ صحرا، او آہوانِ صحرا!

اے ابرِ چیپ نہ رہنا میرا فسانہ کہنا! — مل جائے گر کہیں وہ سروِ روانِ صحرا!

دشتی کی دُھن میں ساقی، اک نغمۂ عراقی!

ہاں پھر سنا بیادِ گل چہرگانِ صحرا!

"آنکھوں میں بس رہا ہے نقشِ بتانِ صحرا | او داستاں سرا چھیڑ، اک داستانِ صحرا!
مستانہ جا رہا ہے پھر کاروانِ صحرا | ہاں جھوم کر حدی خواں اک داستانِ صحرا
دیہات کی فضائیں آنکھوں میں پھر رہی ہیں | دل میں سما رہی ہے یادِ بستانِ صحرا
نظروں پہ چھا رہا ہے وہ چاندنی کا منظر | صحرا میں کھاتی تھیں جب حوریانِ صحرا
وہ چاندنی کا موسم، وہ بے خودی کا عالم | وہ نور کا سمندر، ریگِ روانِ صحرا
جلوے مہ جواں کے، وہ زنگ کارواں کے | وہ نغمے ساربان کے، رقصاں میانِ صحرا
کیونکر نہ یاد آئیں، وہ سیمگوں فضائیں | وہ آسمانِ صحرا، ماہِ روانِ صحرا
وہ کمسنوں کے گانے، وہ کھیل وہ ترانے | بے فکری کے فسانے، وردِ زبانِ صحرا
کھیتوں میں گھومتے تھے، ہر گل کو چومتے تھے | مستی میں جھومتے تھے جب میکشانِ صحرا
وہ گانو وہ فضائیں، وہ فصل، وہ ہوائیں | وہ کھیت، وہ گھٹائیں، وہ آسمانِ صحرا
پھر یاد آ رہی ہیں، پھر دل دکھا رہی ہیں | مجنوں بنا رہی ہیں، لیلےٰ وشانِ صحرا
راتوں کو چھپ چھپ کے آنا اور ستانے کو ہلانا | ہے یاد وہ جگانا، ہم کو میانِ صحرا

وہ اُن کی شوخ آنکھیں، وہ اُن کی سادہ نظریں
بیخود بنا رہی ہیں دوشیزگانِ صحرا

وہ عشق پیشہ ہوں میں جس کے جوان نغمے
گاتا ہے چاندنی میں ہر نوجوانِ صحرا

اک بدویت کا عاشق، صحرائیت سے بے خود
اختر بھی اپنی دُھن میں ہے اک جوانِ صحرا

آزادی

صبا پلاتی ہے ہر وقت جامِ آزادی شمیم لاتی ہے ہر دم، پیامِ آزادی

مہ و ستارہ کی آزاد کرنیں کہتی ہیں پیامِ چرخِ بریں ہے، پیامِ آزادی

پکارتی ہے ہما لہ کی رفعتِ آزاد کہ ہے ستاروں کا ہمسر مقامِ آزادی

چلی نسیم، اٹھیں نکہتیں، اُڑے طائر چمن میں دیکھے کوئی اہتمامِ آزادی

سبق یہ ملتا ہے دریاؤں کی روانی سے جہاں میں کوئی نہ ہو تشنہ کامِ آزادی

جو بوالہوس ہیں وہ تکلیفِ اعتنا نہ کریں مقامِ عیش نہیں ہے مقامِ آزادی

کرے نہ مرغِ چمن حوصلہ تو کس کا قصور قفس سے دُور نہیں ہے مقامِ آزادی

ہو طعنہ زن کوئی کیوں ہم پہ حضرتِ اختر

غلام بھی ہیں تو ہم ہیں غلامِ آزادی

ابر سے

برس، نہ دیر کر اے ابرِ نو بہار برس! برس کہ دیر سے تھا تیرا انتظار برس!

برس، کہ سوز کا گہوارہ بن رہی ہے زمیں برس، کہ تشنہ ہیں وادی و سبزہ زار برس!

برس، کہ آگ برستی ہے گُل فضاؤں سے برس کہ شعلے لٹاتے ہیں کوہسار برس!

فسردگی سی ہے طاری گل و ریاحیں پہ الم زدہ سے ہیں اشجار و شاخسار، برس

ترشّح سے نہیں تسکینِ قلبِ سوزاں کو برنگِ جوششِ طوفانِ آبشار برس!

برس کہ رنگ ابھی بدلا نہیں درختوں کا ہیں انتظارِ جوانی میں لالہ زار برس!

برس کہ خاک کا دل ہو نہیں سکا سیراب ہیں صیدِ تشنہ لبی، اب بھی غنچہ زار برس

برس نہ شہر پہ گر شہریوں کو نفرت ہو
مگر ہیں منتظرِ لطف، کاشتکار، برس!

چمن زار، شاداب و خنداں رہیں گے   درختوں پہ طائر غزل خواں رہیں گے

فضاؤں میں بادل پر افشاں رہیں گے

مگر ہم تہِ خاک پنہاں رہیں گے!

گھٹائیں گلستاں پہ چھایا کریں گی   فضائیں یونہی لہلہایا کریں گی

درختوں کے دامن گل افشاں رہیں گے

مگر ہم تہِ خاک پنہاں رہیں گے!

چمن کی فضائیں مہکتی رہیں گی   صبا کے اثر سے لہکتی رہیں گی،

گل و غنچہ و برگ، رقصاں رہیں گے

مگر ہم تہِ خاک پنہاں رہیں گے!

یہ شہر اور دیہات بستے رہیں گے ۔۔۔ صداؤں سے معمور رستے رہیں گے
بپا زندگانی کے طوفاں رہیں گے
مگر ہم تہِ خاک پنہاں رہیں گے!

گھٹائیں یونہی گھر کے آیا کریں گی ۔۔۔ یونہی بلبلیں گیت گایا کریں گی
یونہی گلستاں، گل بداماں رہیں گے
مگر ہم تہِ خاک پنہاں رہیں گے!

عروسِ سحر روز آیا کرے گی ۔۔۔ فضا نور سے جگمگایا کرے گی
مناظر سحر خیز و خنداں رہیں گے!
مگر ہم تہِ خاک پنہاں رہیں گے!

یہ راتیں یونہی جھلملایا کریں گی ۔۔۔ ستاروں کی شمعیں جلایا کریں گی
سرِ چرخ روشن چراغاں رہیں گے!
مگر ہم تہِ خاک پنہاں رہیں گے!

کہستاں سے چشمے اُبلتے رہیں گے سرِ راہ موتی پگھلتے رہیں گے

یہ سیلابِ سیمیں، خراماں رہیں گے

مگر ہم تہِ خاک پنہاں رہیں گے!

غرض یہ خدائی کے رنگیں نظارے یہ شام و سحر کے بہاریں نظارے!

خراماں و رخشاں و رقصاں رہیں گے!

مگر ہم تہِ خاک پنہاں رہیں گے!

میری داستانِ حیات

ستاروں کی کہانی کہئے، خوابوں کا بیاں لکھیئے
وہ کہتی ہیں کہ اپنی زندگی کی داستاں لکھیئے!

ہماری زندگی، نیرنگیٔ عالم کا منظر ہے،
کبھی آرامِ دل کہئے، کبھی آزارِ جاں لکھیئے!

چمن میں برگِ گل پر قطرۂ شبنم جو لرزاں ہے
اُسے پیشِ نظر رکھئے، ہماری داستاں لکھیئے!

کبھی ہر سانس کو اک نکہتِ آبِ بقا کہیئے
کبھی ہر لمحے کو پیغامِ مرگِ ناگہاں لکھیئے!

کبھی خوابِ زلیخا کہیئے ہر شب کے نظاروں کو
کبھی افسانۂ یوسف بدستِ کارواں لکھیئے!

کبھی پھولوں کی سیجوں کو ہمارا دردِ سر کہیئے
کبھی جنگل کے کانٹوں کو ہمارا آشیاں لکھیئے!

کبھی ہر لمحۂ غم کو خلاصہ کہیئے دوزخ کا
کبھی ہر فرصتِ رنگیں کو عمرِ جاوداں لکھیئے!

کبھی بیگانگیٔ دیر و کعبہ کا بیاں کیجے
کبھی افسانۂ رسوائی کوئے بتاں لکھیئے!

کبھی شادابیٔ گلہائے نو کا تذکرہ کیجے
کبھی افسانۂ بربادیٔ برگِ خزاں لکھیئے!

کبھی پریوں کے سینوں کو ہمارا رازداں کہیئے
کبھی حوروں کے ہونٹوں کو ہمارا ہم زباں لکھیئے!

کبھی سلمیٰ کے رومانِ حسیں کے تذکرے کیجے
کبھی عذرا کے افسانے کو عشقِ رائگاں لکھیئے!

کبھی نسرین کی الفت کو گلے کا ہار کہہ لیجے
کبھی ریحانہ کی بدو یتوں کو حرز جاں لکھیے!
کبھی پروین کی مرگ عاشقی پر فاتحہ پڑھیے
کبھی شمسہ کے زہر آلود ہونٹوں کا بیاں لکھیے!
کبھی حسن ثریا کو ہمارا آشنا کہیئے
کبھی ناہید کے دل کو ہمارا آشیاں لکھیے!
کبھی شیریں کے مستانہ تبسم کا بیاں کیجے
کبھی لیلیٰ کے خونیں آنسوؤں کی داستاں لکھیے!
کبھی دھرایئے قصہ جہانگیر ابن اکبر کا
کبھی اپنے اودہ کے جان عالم کا بیاں لکھیے!
کبھی غالب کو اور مومن کو کہیئے ہمصفیر اپنا
کبھی خیام و حافظ کو ہمارا ہمزباں لکھیے!

الف سے ی تلک، القصہ، جو بھی نام دلکش ہو
ہر اک سے بدگماں ہو کر، ہر اک کی داستاں لکھیے

کبھی فرطِ غم و آلام کو محرِ زباں کہیے
کبھی افکارِ شعر و عشق کو جوئے رواں لکھیے

کبھی ہر بے دلی کو غم کا اک تحت الثّرےٰ کہیے
کبھی ہر آرزو کو ایک خوابِ کہکشاں لکھیے

کبھی ہر صبح کو دردِ خمارِ ناگہاں کہیے
کبھی ہر شب کو طوفانِ نشاطِ نوجواں لکھیے

کبھی جنّت کی حوروں کو گدائے درس سمجھ لیجے
کبھی مفلس گداؤں کو ہمارا ہم زباں لکھیے

غرض اختر کی ساری زندگی کا یہ خلاصہ ہے،
کہ پھولوں کی کہانی کہیئے شعلوں کا بیاں لکھیئے!

شکستِ طلسم

عدو کی ہو چکیں جب تم تو دعویٰ کیوں ہے عفّت کا؟

کسی کا ہو رہے کوئی تو پھر عفّت کہاں باقی؟

محبّت کی لطافت، جسم کی عصمت کہاں باقی؟

مری گستاخیوں سے پھر یہ شکوہ کیوں ہے عفّت کا؟

تمہیں مجھ سے محبّت تھی، مجھے تم سے محبّت تھی!

میں سو جاں سے تمہاری عفّتوں کی قدر کرتا تھا!

تمہاری عظمتوں کی، عصمتوں کی قدر کرتا تھا!

تمہاری رُوح میں اور جسم میں جب تک لطافت تھی!

مگر اب جب، عدو کی ہو کے تم اِن سب کو کھو بیٹھیں!
تمہارا جسم جھوٹا ہو چکا، افکار بھی جھوٹے!
تمہارے ہونٹ جھوٹے ہو چکے اور پیار بھی جھوٹے!
تم اپنے ہاتھوں اپنی عفّتوں سے ہاتھ دھو بیٹھیں!
تو پھر، مجھ کو، مجھی کو شوق کیوں ہو پارسائی کا
تمہیں بھی چاہیے تھا پاس میری نارسائی کا

یادِ رفتہ

محبت کی امنگیں میرے دل کو گدگداتی ہیں
کہ اک بھولی ہوئی مہرو کو جا کر پیار کر آؤں
سرورِ عشقِ رفتہ سے اُسے سرشار کر آؤں

کہوں جا کر، "تری پچھلی وفائیں یاد آتی ہیں
تری نظریں تصوّر میں ابھی تک مسکراتی ہیں"
وہ نظریں، چاہتا ہوں پھر اُنہیں بیدار کر آؤں
جہاں بھر کے خیال و خواب سے بیزار کر آؤں

یہ بے خود آرزوئیں مجھ کو دیوانہ بناتی ہیں!

مگر، پھر سوچتا ہوں، جاؤں کیونکر اس کے ایوان تک

کہ اس نے مدّتوں سے اک نئی دنیا بسائی ہے!

وہ دنیا آہ جو میری نہیں، ہمدم، پرائی ہے!

تصوّر بھی پہنچ سکتا نہیں، جس کے شبستاں تک

تو ہمدم، اپنے غم کا کس طرح اظہار کر آؤں؟

اور اُس بھولی ہوئی مہرو کو کیوں کر پیار کر آؤں؟

انانیت

چھا رہی ہوں بستیوں پر دیو داروں کی طرح
اور بلندی پر عقابِ پرفشاں کی شکل میں
اک نگاہِ بے صدا و بے نشاں کی شکل میں

سربلندی پائی میں نے کوہساروں کی طرح
کوہساروں سے بھی برتر، ابر پاروں کی طرح
حدِ آخر، میری طلعت آسماں کی شکل میں
عظمتوں سے کھیلتی ہوں کہکشاں کی شکل میں

خندہ زن ہوں بزمِ خاکی پر ستاروں کی طرح

رعد کی صورت گرجتی ہوں، بساطِ خاک پر
کانپ اٹھتے ہیں سمندر جس سے وہ طوفاں ہوں میں
سینۂ ہستی کی اک فکر شرر افشاں ہوں میں
ہیں قدم میرے زمیں پہ، سر مرا افلاک پر
صورتِ اندیشۂ ہستی میں بکھر جاتی ہوں میں
پردہ ہائے ماہ و انجم سے گزر جاتی ہوں میں

میرا راز

تیرا دل، موسیقیٔ احساس کا اک ساز ہے!
جس کی فریاد، اشکِ خونیں ہو کے بہہ سکتی نہیں
اور خموشی بن کے سینے میں بھی رہ سکتی نہیں
یعنی تیرے دل میں مضطر، کوئی غمگیں راز ہے!
جو ہم آہنگِ فغاں ہو کر بھی بے آواز ہے!
روح تیری جس کی بے تابی کو سہہ سکتی نہیں!
اور کہنا بھی اگر چاہے تو کہہ سکتی نہیں
نالۂ مجبورِ سکوں حالات کا اعجاز ہے!

لیکن اے شیریں، زمانے میں اک ایسا دل بھی ہے!
جو ترے احساس کی آواز سے ہے آشنا!
تیرے سازِ دل کے غمگیں راز سے ہے آشنا!
جس کا اندازہ، تجھے آساں بھی ہے مشکل بھی ہے!
محوِ حیرت ہو کے اب کیوں گوش بر آواز ہے؟
آہ، تیرے راز کی تفسیر "میرا راز" ہے!

عشرتِ رفتہ

تجھے کیوں عشرتِ رفتہ کی یاد آتی ہے رہ رہ کر؟

مرے نادان دل کچھ تو بتا یہ ماجرا کیا ہے؟
پرانے قصّے دہرانے سے آخر فائدہ کیا ہے؟

بتا ماضی کی دھن کیوں اتنا تڑپاتی ہے رہ رہ کر؟

کسی کا حال دنیا میں کبھی یکساں نہیں رہتا

جہاں دیکھو تغیّر ہی تغیّر کی حکومت ہے
تغیّر، اصلِ ہستی ہے تغیّر اصلِ فطرت ہے

تغیّر ہو نہ جس انساں میں وہ انساں نہیں رہتا

خزاں کے بعد آتی ہیں بہاریں باغِ عالم میں
بہاریں ختم ہونے پر خزاں کا دور آتا ہے
چمن روتا ہے اک دن، دوسرے دن مسکراتا ہے
غرض عمریں گذر جاتی ہیں یوں شادی و ماتم میں

تو اپنے رنج کو راحت بنا سکتا نہیں اے دل!
بلا کر عشرتِ رفتہ کو لا سکتا نہیں اے دل!

دُنیا

تری دنیا میں گر مکار ہی مکار بستے ہیں!
تو میرا سینہ کیوں اخلاص سے معمور ہے یارب؟
مرا ہی دل مئے الفت سے کیوں مخمور ہے یارب؟
ترے اس خانۂ ہستی میں گر عیّار بستے ہیں!
تری دنیا اگر بے درد انسانوں کا مسکن ہے!
تو مجھ کو کیوں کیا ہے دردِ دل سے آشنا تونے؟
مجھی کو کیوں بنایا پیکرِ رحم و وفا تونے؟
تری دنیا اگر خونخوار حیوانوں کا مسکن ہے!

اگر اپنوں کے غم پر مسکراتے ہیں ترے بندے!
تو مجھ کو کیوں پرائے غم پہ بھی رونا سکھایا ہے؟
مری آنکھوں میں کیوں سارے جہاں کا دکھ بسایا ہے؟

اگر اس حال میں آنکھیں چراتے ہیں ترے بندے!
تری دنیا کی رونق، مکر، جھوٹ اور بے وفائی ہے
یہاں تیری خدائی ہے کہ شیطاں کی خدائی ہے؟

عذرا

پری و حور کی تصویرِ نازنیں، عذرا!
شہیدِ جلوۂ دیدار کر دیا تو نے!
نظر کو محشرِ انوار کر دیا تو نے!

بہار و خواب کی تنویرِ مرمریں، عذرا!
شراب و شعر کی تفسیرِ دل نشیں، عذرا!
دل و دماغ کو سرشار کر دیا تو نے!
شباب و عشق کو بیدار کر دیا تو نے!

مری حسین، مری ناز آفریں عذرا!

دیارِ دل میں تُو آئی بہار کی صورت!

گدائے حسن سے اظہارِ عشق تُو نے کیا

گناہگار سے اقتدارِ عشق تُو نے کیا

بسی دماغ میں کیف و خمار کی صورت

مٹا سکے گا نہ اب پیرِ آسماں مجھکو

کہ ہے نصیب، ترا عشقِ نوجواں مجھکو

حوصلے

تودۂ خاک تھی یکسر تری دنیائے حیات!
خونِ دل سے، اِسے گلزار بنایا میں نے
اپنے افکارِ جمالی سے بسایا میں نے
روشِ خلد کا محرم نہ تھا صحرائے حیات!
زینت و ذوق سے بیگانہ تھی لیلائے حیات!
نکہت و رنگ کا انداز سکھایا میں نے
نغمہ و حسن کا اعجاز سکھایا میں نے
رشکِ صد طور و ارم بن گیا سینائے حیات

تیری دنیا تھی محبّت سے سراسر محروم!

میں نے یہ دردِ حسیں آکے سکھایا اس کو
کیفِ صہبائے غمِ روح بتایا اس کو

ورنہ یہ خاک تھی لذّت سے سراسر محروم!

آخری پردہ بھی اک روز اُٹھا ہی دُوں گا!
تیری صورت بھی زمانے کو دکھا ہی دُوں گا!

زندگی

زندگی مست ہے اس طائرِ ناداں کی طرح

جو ہو تنہا نگراں دُور فضاؤں کی طرف

مہ و خورشید کی زرکار ضیاؤں کی طرف

محوِ نظّارہ کبھی نرگسِ حیراں کی طرح

اور کبھی بال فشاں بُوئے خیاباں کی طرح

مُسکراتی ہوئی شاداب گھٹاؤں کی طرف

وادیٔ کوہ کی مستانہ ہواؤں کی طرف

نکہتِ گل کدہ و سنبلِ بیاباں کی طرح

آرزو اڑنے کی کرتی رہے بیتاب سدا

پر نظر آئے نہ تسکین کا انداز اس کو

یونہی ترساتی رہے حسرتِ پرواز اس کو

نارسائی کی خلش سے رہے بیخواب سدا

کبھی آرام نہ دے حسرتِ پرواز جیسے

اپنا انجام نظر آئے نہ آغاز جیسے

اپنی مرحوم محبوبہ سے

حضرت مسیح علیہ السلام کی ولادت سے ڈیڑھ سو سال قبل چین پر نوجوان شہنشاہ ووتی کی حکومت تھی ایک دن یکایک اس کی محبوبہ لی فوجین کا انتقال ہوگیا۔ شہنشاہ کو اس کی دائمی مفارقت کا شدید صدمہ ہوا اس نے ملک بھر کے نامور جادوگروں کو دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا اور کہا کہ جس طرح بھی ہو سکے وہ لی فوجین کی روح سے اسکی ملاقات کرائیں کہتے ہیں کہ جادوگروں نے سچ مچ ایک پردۂ سیمیں پر شہنشاہ کی محبوبہ کا عکس دکھا دیا۔ ذیل کی نظم اس سوگوار شہنشاہ کی لکھی ہوئی ہے جسکے ایک ایک مصرعہ سے یاس و حسرت ٹپک رہی ہے

سرسراہٹ ریشمیں ملبوس کی خاموش ہے — فرش قصرِ مرمریں کا گرد میں روپوش ہے

پائے نازک کی صدا آتی نہیں ایوان سے — شمعِ زریں، خواب گہ کی تیرگی بردوش ہے

بام و در پر برگ ہائے خشک کے انبار ہیں — صحنِ گلشن غنچہ و گل سے تہی آغوش ہے

آہ! وہ جانِ جہاں دُنیا سے رخصت ہو چکی!

دل میں جو مہمان تھی، مہمانِ تربت ہو چکی!

افکارِ پشتو

جب التجائے بوسہ کی محبوبۂ طناز سے
ابریشمیں لب ہو گئے چسپیدہ باہم ناز سے
جیسے کوئی نازک کلی
نازاں مگر محجوب ہو

محبوبۂ شیریں ادا بستر پہ یوں خوابیدہ ہے
جیسے غزالِ نازنیں مدہوش و آرامیدہ ہے
پھولوں کی نازک سیج پر
جو رُوح کو مرغوب ہو

گر میرا تکیہ بن سکیں　　وہ بازوئے سیمیں کبھی

سر کو اٹھاؤں مَیں نہ پھر　　اے خاطرِ غمگیں کبھی

اس حال میں کیا رہ گیا

تا حشر جو مطلوب ہو